جلد ۱۱۴ - ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق جولائی ۱۹۷۴ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اتحاد اسلامی اتنی بڑی طاقت ہے کہ اگر اس سے کام لیا جائے تو بین الاقوامی دنیا میں مسلمانوں کا وزن پیدا ہو جائے اور بہت سے مسائل میں بیلنس ان کے ہاتھ میں آجائے، اس وقت ۳۰ - ۳۵ اسلامی ملک ہیں، جنکا سلسلہ افریقہ سے لیکر ملیشیا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے، اور مراکش سے لیکر لاہور تک مسلسل اسلامی ملک ہیں، اگر یہ سب متحد ہو جائیں تو بڑی بڑی طاقتوں سے اپنا لوہا منوا سکتے ہیں، زبانوں پر تو ہمیشہ اتحاد اسلامی کا نام رہا لیکن وہ عملاً قائم نہ ہو سکا، جب بھی اسکی تحریک ہوئی مغربی حکومتوں نے اسکے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ وہ آگے نہ بڑھ سکی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں بیشتر اسلامی حکومتیں مغربی طاقتوں کے زیر اقتدار یا کم سے کم انکے زیر اثر تھیں، آزاد حکومتیں بھی نیم جان تھیں، انکی مالی حالت نہایت خراب تھی اور وہ ہر چیز میں مغربی حکومتوں کی محتاج تھیں، اس لیے انکی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں،

اب صورت حال بدل گئی ہے، قریب قریب یہ سارے ملک آزاد ہو چکے ہیں، مشرق وسطیٰ کی سرزمین پٹرول کی شکل میں سونا اگل رہی ہے، جسکی ساری حکومتیں محتاج ہیں اور ان ملکوں کے پاس اتنی دولت ہو گئی ہے کہ اسکے رکھنے کا ٹھکانا نہیں ہے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اب بین الاقوامی حالات ایسے ہو گئے ہیں جنھوں نے متضاد عقیدہ رکھنے والی طاقتوں کو آپس میں مفاہمت پر مجبور کر دیا ہے، اور ہر ملک اپنے مفاد کیلئے اپنا حلقہ بنا رہا ہے، اسلیے مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر خالص سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی ملکوں کے مفاد کیلیے ان میں اتحاد ضروری ہے، اس کا انکو تجربہ ہو چکا تھا کہ قومیت اور وطنیت ان کو متحد نہ کر سکی، اسلیے انکا شیرازہ منتشر کر دیا، اس نے عثمانی حکومت کا خاتمہ کیا، اور عربوں کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کرکے انکی قوت توڑ دی، اسی نے مصر کو فرعونیت، ترکی کو تورانیت اور ایران کو مجمیت کے احیا پر ابھارا، جس نے انکو ایک دوسرے سے دور کر دیا،

اسلیے اسلام ہی انکو متحد کر سکتا ہے، اس مقصد کیلیے انکو امیر فیصل جیسا مدبر رہنما مل گیا جس نے اپنے سارے وسائل اتحاد اسلامی کے لیے وقف کر دیے ہیں،

اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی کانفرنسیں سب اسی احساس کا نتیجہ ہیں، لاہور کی اسلامی کانفرنس اور کوالالمپور کی اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، وزرائے خارجہ کی کانفرنس کی پوری روداد اخبارات میں آچکی ہے، اس میں جو تجویزیں پاس ہوئیں وہ اسلامی ملکوں کے تمام اہم مسائل اور ان کی عہد حاضر کی جملہ ضروریات پر حاوی ہیں، اس سے پہلے لاہور کانفرنس میں ترقی پذیر ملکوں کی امداد کی تجویز پاس ہو چکی ہے، جس میں غیر مسلم ملک بھی شامل ہیں، یہ اس کا ثبوت ہے کہ کانفرنس کے پیش نظر ایشیا و افریقہ کے تمام کمزور ملکوں کی فلاح و ترقی ہے، اس لیے اتحاد اسلامی اور اسلامی کانفرنس سے ان سب کو فائدہ پہنچے گا اور اس کی قوت سے ان کو بھی تقویت حاصل ہو گی،

مسلم اقلیتوں کی شکایتوں کے تدارک کے بارہ میں جو تجویز ہے اس میں اسکی وضاحت ہے کہ وہ ان کی حکومتوں کے ذریعہ ہو گی، اس لیے اس تجویز سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، مظلوم طبقہ کو ظلم سے بچانا تو انسانی فریضہ ہے، ایسے موقع پر تو ہر انسان دوست ملک مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، اس لیے اگر اسلامی ملک کسی ملک کی مسلم اقلیت کی شکایتوں یا ان پر ظلم و زیادتی کے تدارک کے لیے ان کی حکومت کو توجہ دلائیں تو اس میں کونسی قابل اعتراض بات ہے، ہماری حکومت کو خاص طور سے اس سے کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونی چاہیے کہ ہمارے دستور میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، اگرچہ ان پر ابھی پورا عمل نہیں ہے، دوسرے یہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ وہ اسلامی برادری کا رکن بننے کا مستحق ہے، اس لیے ہماری حکومت کو لاہور کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مدعو نہ کیے جانے کی شکایت تھی جو بالکل بجا تھی، ہمارے نزدیک اس قسم کی کانفرنسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو نمایندگی ملنی چاہیے،

اس سے یہاں کے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور حکومت کو بھی بدگمانی کا موقع نہ ملے گا۔

مسٹر بھٹو کا بنگلہ دیش میں بڑا پرجوش استقبال ہوا، اور اس نے میزبانی کے سارے فرائض انجام دیے، لیکن پاکستان سے بنگلہ دیش کے اربوں روپے کے مطالبات اور بہاریوں کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ وہ جلد حل نہیں ہو سکتے، اس لیے اس سفر سے جو توقعات تھیں وہ سب پوری نہیں ہوئیں، لیکن مسٹر بھٹو کا بنگلہ دیش جانا بجائے خود مصالحت کے لیے ایک مفید قدم ہے، جس سے آیندہ مفاہمت کی راہ کھلے گی، بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو پاکستان آنے کی دعوت دی ہے، جو انھوں نے قبول کر لی ہے، یہ بھی ایک اچھی علامت ہے، اگر پاکستان کے ذمہ بنگلہ دیش کے مالی مطالبات ہیں تو بہاریوں نے بھی بنگلہ دیش میں اربوں روپے کی املاک چھوڑی ہے، اس لیے دونوں میں مفاہمت کا نقطہ نکل سکتا ہے، اب ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح اسلامی ملکوں نے مسٹر بھٹو اور مجیب الرحمٰن کو ملایا تھا، اسی طرح ان معاملات میں بھی مفاہمت کی کوشش کریں، اس کی ذمہ داری ہندوستان پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر برصغیر میں امن قائم نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں بھٹو کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایٹمی دھاکے کی وجہ سے سارے معاملات پر گفتگو ختم نہ کر دیں، کم سے کم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت اور خط و کتابت وغیرہ کی آزادی کا مسئلہ جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت تکلیف ہے طے کرنے کی کوشش کریں، اس سے آیندہ کے لیے خوشگوار فضا پیدا ہوگی۔

مقالات

کچھ قابلِ غور باتیں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

مغربی تہذیب دنیا پر اتنی چھا گئی ہے اور ہوا کی طرح سرایت کر گئی ہے کہ کوئی قوم بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی، اور اس کے سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، انسانی تہذیب کوئی جامد چیز نہیں، بلکہ ارتقا پذیر ہے، اس کا قدم برابر آگے بڑھتا رہتا ہے، جو قوم بھی اس ارتقا کا ساتھ نہ دے گی اور دوسری تہذیبوں کی مفید چیزوں کو قبول نہ کرے گی وہ ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جائے گی، اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا، اس لیے مختلف قوموں کے درمیان تہذیبی لین دین کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے، لیکن ہر قوم کا مزاج اس کی روایات اور اس کا کلچر جدا ہوتا ہے، جس پر اس کی انفرادیت اور قومی وجود کا دار و مدار ہوتا ہے، اس لیے کسی قوم کی تہذیب کے سارے اجزا، دوسری قوم کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے، اگر وہ قبول کرے گی تو وہ اس قوم میں ضم ہو جائے گی، اور اس کا قومی وجود ختم ہو جائے گا،

اس لیے تہذیبی لین دین میں اس کا لحاظ ضروری ہے کہ کسی قوم کے لیے دوسری تہذیب

کے کونسے اجزا قابل قبول ہیں اور کونسے قابل رد، مفید اور صالح اجزا کے قبول کرنے سے
تہذیبی ترقی اور قومی زندگی میں استحکام پیدا ہوگا اور مضر اور قومی مزاج کے خلاف
عناصر کے قبول کرنے سے قومی انفرادیت ختم ہو جائے گی، مسلمانوں کا سابقہ مختلف تہذیبوں
سے رہا اور انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے ان کی مفید چیزیں قبول کیں، حتیٰ کہ جن
قوموں کو انھوں نے مغلوب کر لیا تھا ان سے بھی تہذیبی استفادہ کیا، چنانچہ حکومت کے
اداروں کی تنظیم اور معاشرتی نفاستوں میں ایران و روم سے، علوم و فنون میں یونان
ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے فائدہ اٹھایا، ہندوستانی معاشرت سے تو اتنے
متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، مگر اس پر اپنی تہذیب
کی ایسی چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تہذیب کہلانے لگی، اور اس کو ایسا نکھارا کہ وہ اپنے
دور کی معیاری تہذیب بن گئی جسکو دوسری قومیں فخریہ اختیار کرتی تھیں، مگر اس اخذ و استفادہ
میں اپنے عقائد و افکار اور قانون و شریعت کو بڑی حد تک محفوظ رکھا، اور ہر زمانہ میں
ایک جماعت ایسی موجود رہی جو ان چیزوں کو بیرونی اثرات سے پاک کرتی رہی جس سے
ان کا کلچر جس پر ان کے ملی تشخص کا مدار تھا، بڑی حد تک محفوظ رہا۔

لیکن مغربی تہذیب کے سامنے انھوں نے سپر ڈال دی، اس کا سبب سیاسی
زوال کے ساتھ ان کی اخلاقی پستی اور علم و فن سے تہی دامنی تھی، ایک زمانہ میں انھوں نے
مغربی قوموں کو علم و فن اور تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا تھا، پھر ان پر ایسا زوال آیا
کہ حکومت کے ساتھ علم و فن اور اخلاقی فضائل بھی ان سے رخصت ہو گئے، اسی زمانہ میں
مغربی تہذیب کا عروج ہوا، اور اس نے جدید علوم کی نوع صنعتی ایجادات کے اسلحہ
اور سائنس کی قوت کے ساتھ مشرق پر یلغار کی، مسلمانوں کے ایک طبقہ نے جو اس کے مقابلہ

کے صحیح طریقوں سے واقف نہ تھا، قدیم حصار میں محصور رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور بلا امتیاز
خوبی و خرابی اس کی ہر چیز کی مخالفت کی، اس سے یہ طبقہ تو اس کے اثرات سے محفوظ رہا،
لیکن مغربی تہذیب کا سیلاب اتنا طاقتور اور ضرورت زمانہ کے مطابق تھا کہ مسلمانوں
کی اکثریت نے اس کے سامنے سپر ڈال دی اور عیب و ہنر کے امتیاز کے بغیر
اس تہذیب کی ہر چیز قبول کر لی۔

مغربی تہذیب کے دو رخ ہیں، اس کے سائنسی علوم ٹکنالوجی صنعت و حرفت،
زندگی کے اصولوں پر عمل اس کا روشن اور قابل تقلید رخ ہے جس کے بغیر آج کوئی قوم
زندہ نہیں رہ سکتی اور اسکی مادہ پرستی، فسق و فجور، قوت و دولت کی پرستش، اخلاقی اقدار کی پامالی
تاریک اور قابل ترک رخ ہے، مسلمانوں نے اپنی پست ہمتی اور تن آسانی سے اس کا ایک
رخ جس میں نفس کے مطالبات کی تسکین کا زیادہ سامان تھا قبول کیا، اور روشن رخ کی
طرف جس کے لیے محنت، جفاکشی، جگر کاوی و جانکاہی اور ایثار و قربانی کی ضرورت تھی
بہت کم توجہ کی، اس لیے ان میں مغربی تہذیب کی برائیاں زیادہ اور خوبیاں
کم پیدا ہوئیں،

اگرچہ مغربی اقوام کی یلغار پورے ایشیا پر تھی، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس کا نشانہ
مسلمان زیادہ تھے، عیسائیت کو سب سے زیادہ نقصان اسلام اور مسلمانوں سے پہنچا تھا،
دونوں میں صدیوں مقابلہ جاری رہا، جنگ صلیبی میں مسلمانوں نے یورپ کی متحدہ
طاقتوں کو شکست دی، اور ان کے قدم ایشیا سے اکھاڑ دیے، اور خود یورپ کے مختلف
حصوں کو فتح کر لیا، مسلمانوں کی جغرافیائی اہمیت یہ تھی کہ یورپ کے دروازے مراکش
سے لیکر ہندوستان تک جو ایشیا میں داخلہ کا راستہ تھا مسلسل اسلامی حکومتیں تھیں،

ان کو زیر کیے بغیر اُن کے قدم ایشیا میں نہیں جم سکتے تھے، اس لیے ان کی اصل ٹکر مسلمانوں سے
تھی، انھوں نے ان کو سیاسی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے مغلوب کرنے کی کوشش کی، ایک طرف
ان کی فوجیں مسلمان حکومتوں کو زیر کرنے کی مہم میں مصروف تھیں، دوسری طرف عیسائی مبلغین
اور مستشرقین، ان کے مذہب پر حملہ آور ہوئے، اور اسلام اور اس کی تعلیمات قرآن مجید،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو علمی رنگ میں اعتراضات
کا نشانہ بنایا اور ان کی ایسی تاریک تصویر پیش کی جس سے نہ صرف اسلام اور مسلمان دوسری
قوموں میں بدنام ہوں بلکہ خود مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک و شبہات
پیدا ہو جائیں، اور مذہب سے جو ان کی قوت کا سرچشمہ ہے، ان کا رشتہ کمزور ہو جائے،[1]

اسی کے ساتھ جہاں ان کو قدم جمانے کا موقع ملا، انھوں نے نظام تعلیم ایسا بنایا جس سے
خود بخود ذہن و دماغ اس کے سانچے میں ڈھل جائیں، اور مسلمان ہر چیز کو انہی کی لگائی ہوئی
عینک سے دیکھنے اور انہی کی زبان میں بولنے لگیں، اس تعلیم نے ہر اسلامی ملک میں ایک
طبقہ پیدا کر دیا جو مغرب کی تقلید ہی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتا ہے، لیکن اس زہر کا تریاق

---

[1] یہ تو صرف چند موٹی موٹی باتیں ہیں، مستشرقین نے اس قسم کی بہت سی شکلیں اختیار کیں جن کی تفصیل میں پڑنے کا
یہ موقع نہیں ہے، اس میں انھوں نے ہر قسم کے کذب اور تدلیس سے کام لیا، مسلمان علماء اور محققین نے اس کے جواب بھی دیے
لیکن ایک طبقہ اس سے پوری طرح متاثر ہو گیا۔

مستشرقین میں بعض ایماندار اور منصف مزاج بھی تھے، انکے احسان کا اعتراف بھی ضروری ہے، انھوں نے اسلام اور
مسلمانوں پر بڑی محققانہ کتابیں لکھیں اور ان میں انکی صحیح تصویر پیش کی، اور مسلمانوں کے علمی اور تہذیبی کارناموں کا
پورا اعتراف کیا، عربی اور فارسی کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں تلاش کر کے انکو بڑی صحت اور اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ
شائع کیا، اور انکی بدولت اہل علم کو ان نایاب کتابوں سے جن کے صرف نام معلوم تھے، استفادہ کا موقع ملا۔

بھی مہیا ہوتا رہا اور تجدد پسندی کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریکیں بھی جاری رہیں، اور مسلمان
علماء و محققین مستشرقین کے پھیلائے ہوئے اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے، اس سے
دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں سے مذہب کی چنگاری بجھنے نہ پائی،

مسلمانوں کو ہر دور میں اس قسم کی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ان کا ایک طبقہ
اس سے متاثر بھی ہوا، لیکن من حیث القوم وہ اس کو جھیل لے گئے، ابھی مغربی تہذیب
کے حملہ سے نجات نہیں ملی تھی کہ اس سے بھی مہیب سیلاب کمیونزم کا امنڈ پڑا جو مغربی
تہذیب سے بھی زیادہ خطرناک ہے، مغربی قوموں سے اگرچہ عملاً مذہب ختم ہو چکا ہے، لیکن
اس کا نام باقی ہے اور رومن کیتھلک میں اس کا کچھ اثر بھی موجود ہے، کلیسا کا تبلیغی نظام
پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، لیکن کمیونزم کی بنیاد ہی الحاد اور بے دینی پر ہے، وہ سارے
مذاہب کا دشمن ہے، اور کسی نظام اخلاق کا پابند نہیں، اس لیے اس میں مغربی تہذیب
سے بھی زیادہ آزادی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ مذہب کے لیے خطرناک ہے، اور اس کا نعرہ
سرمایہ داری کی مخالفت، مزدوروں کی حمایت، اقتصادی مساوات اتنا موثر اور
دلکش ہے کہ ایک دنیا اس کے سحر میں گرفتار ہے، سرمایہ دار ملکوں میں بھی اس کے قدم
پہنچ گئے ہیں، اور نوجوان نسل تو بے سمجھے بوجھے اس کے پیچھے دوڑی چلی جا رہی ہے، اور اب
کمیونزم میں اتنی طاقت آگئی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس سے خوفزدہ ہیں، اور
اس کے مخالفین بھی سوشلزم کا نام لینے پر مجبور ہیں، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونزم سارے
دنیا میں پھیل کر رہے گا، لیکن ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے، اور اس کی بنیاد مذہب و
اخلاق کے بجائے مادیت اور الحاد اور تعمیر کے بجائے تخریب پر ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا
آخری انجام کیا ہوگا،

کمیونزم درحقیقت یورپ کی مفرط سرمایہ داری اور اس کی برائیوں کا رد عمل ہے، اس میں بعض خوبیاں بھی ہیں، لیکن اس کی مادیت، الحاد اور انتہا پسندی نے اس کی خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، خود اسلام انسانوں میں ادنیٰ و اعلیٰ کی تقسیم، جاگیرداری اور ایسی اقتصادی ناہمواری کا مخالف ہے، جس میں ایک شخص قارون بن جائے اور دوسرے کو پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہ ہو، اس نے سرمایہ کے حصول اور ذاتی املاک کو ختم تو نہیں کیا اور مکمل اقتصادی مساوات قائم نہیں کی جو بالکل خلاف فطرت ہے، لیکن سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کو دور کر دیا، اور سرمایہ پر ایسی قیدیں لگا دیں اور سرمایہ داروں پر اتنی قانونی پابندیاں اور اخلاقی ذمہ داریاں عائد کر دیں کہ اگر ان پر پورا عمل ہو تو غیر متدل سرمایہ داری اور غربت و افلاس دونوں کا خاتمہ ہو جائے، افسوس ہے کہ اس مضمون میں اسلامی نظام اقتصادیات پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن مکمل اقتصادی مساوات بالکل خلاف فطرت ہے، ایک تعلیم یافتہ، ذہین، عالی دماغ صنّاع اور سائنس کے ماہر اور معمولی مزدور کی محنت اور اس کے نتائج برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے ان میں مکمل اقتصادی مساوات بھی نہیں ہو سکتی، دونوں کو مساوی درجہ پر رکھنا ذہین انسانوں کی دماغی صلاحیتوں پر ظلم ہے، اس لیے اب خود کمیونسٹ ان میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں

کمیونزم کی سب سے بڑی خرابی اس کی مادیت، الحاد اور کلیت پسندی ہے، بظاہر وہ انسانی آزادی کا مدعی ہے لیکن حقیقۃً بدترین قسم کا استبدادی نظام ہے، جس میں انسانی ذہن و دماغ پر بھی پابندی ہے، سوویٹ یونین میں کمیونزم کے خلاف کچھ سوچنے اور حسن نیت کے ساتھ بھی اس پر تنقید کی اجازت نہیں، اس کی سزا جلاوطنی یا قتل ہے، چنانچہ روس کے بڑے بڑے مفکرین اور صاحب علم و قلم اس استبداد کی بھینٹ چڑھ گئے، اس لیے

کمیونزم دوسری خرابیوں کے ساتھ انسانی ذہن و دماغ کے لیے بھی خطرہ ہے، مگر اس کا سیلاب اتنا تند و تیز ہے کہ وہ قوتیں جو اس کی مخالف ہیں، اس کے روکنے کی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اس سے مفاہمت پر بھی مجبور ہیں، اس لیے اہل مذاہب ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور یہ ان کا اخلاقی و انسانی فریضہ ہے، لیکن اس زمانہ میں مذہب کا اثر اتنا کم ہو چکا ہے کہ اس کے ماننے والوں کو بھی مذہب کے موافق و مخالف تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور وہ ہر ہوا کے ساتھ ہو جاتے ہیں، اور ہر قالب میں ڈھل جاتے ہیں، اس گئی گذری حالت میں مسلمان ہی اس کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں، اس لیے کمیونزم کا اصل مقابلہ اسلام اور مسلمانوں سے ہے، جیسا کہ کمیونسٹوں کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں،

اس پہلو کے علاوہ کمیونزم اور مسلمانوں کے درمیان مخالفت کے سیاسی وجوہ بھی ہیں، مسلمانوں سے روس کا مقابلہ اور ان میں اختلاف مدتوں سے چلا آرہا ہے، روسی ترکستان کا پورا علاقہ آزاد تھا جس میں کئی کروڑ مسلمان ہیں، یہ علاقہ صدیوں سے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز چلا آرہا تھا، اور اس کی خاک سے بڑے بڑے ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، روس اپنے پہلو میں اس کا وجود کس طرح گوارا کر سکتا تھا، چنانچہ اس کو سوویٹ یونین میں ضم کر کے اپنے قہر و استبداد اور ملحدانہ نظام تعلیم کے ذریعہ نئی نسل کو بالکل مسخ کر دیا، مذہب کی پرانی یادگاروں میں کچھ بوڑھے رہ گئے ہیں جن سے اسلام کا نام زندہ ہے، لیکن روس کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام کی چنگاری بجھ نہیں سکی ہے، اور ایک طبقہ میں اپنی اسلامی قومیت کا احساس باقی ہے، جو ممکن ہے آیندہ چل کر بھڑک اٹھے اور روس کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرے، جن سے روس بھی فکرمند ہے اور اس چنگاری کو بھی بجھا دینا چاہتا ہے،

افغانستان، ایران اور ترکی روس کے ہم سرحد ہیں، افغانستان کا کبھی کوئی شمار نہیں رہا، اس لیے روس کے لیے ناقابل توجہ رہا اور اب تو وہ اس کا ضمیمہ بن گیا ہے، لیکن ایران اور ترکی مدتوں اس کے حریف رہے اور ان میں بڑے بڑے معرکے ہوئے لیکن روس ان کو زیر نہ کر سکا، اب بین الاقوامی حالات نے ان کو مصالحت پر مجبور کر دیا ہے، لیکن اب بھی ان کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی روس سے مطمئن نہیں ہے، پاکستان سے روس کی دشمنی بالکل کھلی ہوئی ہے، بنگلہ دیش ابھی نوزائیدہ ملک ہے، روس اس کو بھی پھانسنا چاہتا ہے، اور اسکا خطرہ ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ ایران اور سعودی عرب میں بھی جو کمیونزم کے مخالف اور اتحاد اسلامی کے علم بردار ہیں انقلاب پیدا کر دے،

کمیونزم کا دوسرا مرکز چین ہے، اس نے بھی چینی ترکستان کے مسلمانوں کے ساتھ جن کی کچھ مذہبی اور تہذیبی اہمیت تھی وہی سلوک کیا جو روس نے روسی ترکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، لیکن خاص چینی مسلمانوں کی کبھی کوئی سیاسی، تاریخی اور تہذیبی اہمیت نہیں رہی، وہ چین کے رنگ میں بالکل رنگے ہوئے تھے، اس کے باوجود ان میں اسلام کے جو اثرات بھی تھے، چین نے ان کو بڑی بے دردی سے مٹایا اور لاکھوں چینی مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، روس اگرچہ اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کا حامی اور ان کا مددگار رہا ہے، لیکن یہ حمایت عربوں سے اخلاص اور ہمدردی کی بنا پر نہیں، بلکہ مشرق وسطیٰ میں امریکی اثرات کے مقابلہ کے لیے ہے، ورنہ اسرائیل کے قیام کے جرم میں وہ بھی برابر کا شریک ہے، فلسطین میں زیادہ آبادی روس کے یہودی مہاجرین کی ہے، جس کا سلسلہ ابتک قائم ہے، اور آج بھی روس اسرائیل کو ختم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ایک حد کے اندر قائم رکھنا چاہتا ہے، اسی لئے عربوں کی ایسی امداد سے گریز کرتا رہا جس سے عرب اسرائیل کو زیر کر سکیں اور اب تو روس

کی خود غرضی کھل کر سامنے آگئی ہے اور سادات اس کو چھوڑ کر امریکہ سے تعلقات پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں،

درحقیقت روس کی حمایت و ہمدردی بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے، وہ اس کا معاوضہ کمیونزم کا نظام یا کم سے کم اس کے اثرات قبول کرنے کی شکل میں وصول کرتا ہے، چنانچہ جس ملک میں بھی روس کے قدم پہنچے ساتھ ساتھ کمیونزم کے اثرات بھی پہنچ گئے، ناصر کے زمانہ میں مصر میں بڑی تیزی سے کمیونزم پھیل رہا تھا، جس کو سادات نے روکا، اس کے دوسرے حلیف شام اور عراق کمیونزم کا شکار ہیں، بہرحال روس دوستی کے اثرات سب کی نگاہ کے سامنے ہیں، لیکن آج کی دنیا میں کوئی ملک خصوصاً چھوٹے ملک بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور وہ اپنی بقا کے لیے ان سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان خطرات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے، ورنہ کمیونزم کا سیلاب ان کو بہالے جائے گا،

ہر نیا نظام اپنی دعوت و تبلیغ اور دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بڑی دلفریب اصطلاحیں ساتھ لاتا ہے، جن کے حقیقی مفہوم و منشا پر غور کیے بغیر لوگ اس کے ظاہری معنی سے مسحور ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے باطنی معنی کچھ اور ہوتے ہیں، مغربی تہذیب اور کمیونزم دونوں نے اس قسم کی اصطلاحیں ایجاد کی ہیں، ان سب کی تفصیل طویل ہو گی، اس لیے صرف چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں، آزادی فکر و خیال مغربی تہذیب کی بڑی دین سمجھی جاتی ہے، جو بظاہر بڑی معقول چیز ہے، جس سے کوئی انسان بھی انکار نہیں کر سکتا، اور ہر عاقل و بالغ کو آزادی فکر و خیال کا پورا حق ہے، لیکن اس میں اپنے عقائد و تصورات اور اپنی روایات و مذہبی قیود سے آزادی بھی شامل ہے، اسلام نے اپنی تعلیمات پر نہ صرف

عقلی حیثیت سے غور وفکر کی اجازت دی ہے بلکہ کلام مجید میں اس کی بڑی تاکید ہے، اور اسکی
آیات افلا یعقلون، افلا یتدبرون جیسے الفاظ سے معمور ہیں، لیکن اس کے کچھ حدود
ہیں، اس کے اندر عقلی غور وفکر کا پورا حق ہے، مگر اس کے باہر اس کی آزادی نہیں ہے،
ہر مذہب وملت کے کچھ بنیادی عقائد اور مسلمات ہوتے ہیں جن کا ماننا ہر حال میں ضروری
ہوتا ہے، خواہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، اس سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں ہے،

انسانی عقل محدود ہے، اس کی رسائی صرف محسوسات تک ہے، اس کے ماوراء عالم کے
ادراک سے وہ قاصر ہے، پھر عقل کا کوئی ایک معیار نہیں ہے، ہر شخص کی عقل مختلف ہوتی ہے، جو
ہر چیز ایک شخص کی عقل میں نہیں آتی، وہ دوسرے کی عقل میں بالکل بدیہی نظر آتی ہے، ایک جاہل
کی عقل سے جو چیز باہر ہوتی ہے، ایک تعلیم یافتہ شخص اس کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے، پھر پیشہ اور علم و
فن کے اعتبار سے بھی عقلیں مختلف ہوتی ہیں، جو اپنے فن کے دائرے میں تو کام دیتی ہیں، مگر اسکے
باہر بیکار ہو جاتی ہیں، بلکہ ایک ہی شخص کی عقل عمر کے مختلف مرحلوں میں بدلتی رہتی ہے، اسلیے
ہر چیز میں تنہا عقل کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اور کچھ چیزوں میں اپنے سے زیادہ صاحب عقل و بصیرت
کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، زندگی کا سارا کاروبار اسی پر قائم ہے، فلسفہ اور سائنس کے پیچیدہ
مسائل پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے، ان میں انکے ماہرین کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اور اس کو
ہر شخص بے چون وچرا مان لیتا ہے، علاج میں ڈاکٹر کی اور قانونی معاملات میں وکیل کی رائے معتبر
مانی جاتی ہے، اور کوشش کر کے اس کو حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح مذہب کے مابعد الطبیعی مسائل میں
جو انسانی عقل سے ماوراء ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بیان پر جن کو انکا علم وعرفان حاصل ہوتا ہے،
اعتماد کرنا ضروری ہے، اس لیے کلام مجید نے ایک طرف تو اپنی تعلیمات پر عقلی غور وفکر کی تاکید
کی ہے لیکن جو چیزیں انسانی عقل سے ماوراء ہیں، ان پر ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا ہے،

دوسری اصطلاح **رواداری** ہے، اس کا یہ مفہوم تو بالکل صحیح ہے کہ دوسرے مذاہب اور
ان کے ماننے والوں کو برا نہ سمجھا جائے، ان کی خوبیوں کا اعتراف اور ان کے صلحاء واخیار کا احترام
کیا جائے، ان کے حقوق رفاقت ادا کیے جائیں، ان کے درد دکھ میں شرکت کیجائے، لیکن یہ معنی
صحیح نہیں ہیں کہ ان کے دینی عقائد وتصورات کو بھی خواہ وہ ہمارے دین ومذہب کے خلاف ہی
کیوں نہ ہوں مانا جائے، ان کے مذہبی رسوم وشعائر میں شرکت کیجائے، رواداری کا صحیح مفہوم
دوسرے مذہب والوں کے ساتھ حسن معاشرت اور شریفانہ وبرادرانہ سلوک ہے، تعصب
اس معنی میں تو ناپسندیدہ ہے کہ دوسرے مذہب کو برا سمجھا جائے، ان کے ماننے والوں کی بدخواہی
کیجائے، لیکن اپنے فرقہ کی خیرخواہی اور اپنے عقائد میں رسوخ اور عمل میں استقامت تعصب
نہیں ہے، بلکہ ہر صاحب مذہب کے لیے ضروری ہے، ہر مذہب کے کچھ مثبت اور کچھ منفی عقائد ہوتے
ہیں، مثبت عقائد کا ماننا اور منفی سے انکار ضروری ہے، مثلاً توحید ورسالت اسلام کا رکن اعظم
ہیں، اس کے اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، اس لیے کوئی مسلمان اس میں
اور دوسرے اسلامی شعائر میں رواداری نہیں برت سکتا، اس قسم کی رواداری وہی مذاہب
برت سکتے ہیں، جن کے کوئی مثبت اور منفی عقائد نہیں ہیں اور متضاد عقائد رکھنے والے اسمیں
داخل رہتے ہیں. دنیاوی نظاموں میں بھی اسی پر عمل ہے، اس کی سب سے بڑی مثال کمیونزم ہے،
جو شخص اس کے بنیادی اصولوں سرمایہ داری کی مخالفت اور اقتصادی مساوات کو
نہیں مانتا وہ کبھی کمیونسٹ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی کمیونسٹ اس میں رواداری برت
سکتا ہے، اس لیے جو چیز دنیاوی نظاموں کے لیے ضروری مانی جاتی ہے، وہ مذہب میں
کیوں بری سمجھی جائے، مذہب تو دنیاوی نظاموں سے زیادہ بلند وبرتر نظام حیات ہے،
درحقیقت یورپ نے مذہب سے جو آزادی حاصل کی ہے اس کو ساری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے،

اور اس کے لیے یہ خوبصورت اصطلاحیں ایجاد کی گئی ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ یورپ جس حد تک اور جس رنگ میں بھی مذہب کو مانتا ہے اس پر آج بھی قائم ہے، اور ان یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر جنھوں نے مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دیا ہے، کوئی یہودی اور عیسائی اپنے عقائد کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو اور یہودی حضرت موسیٰؑ کو انسانوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، تثلیث اور کفارہ پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور ساری دنیا کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اسکے لیے دنیا بھر میں ان کا تبلیغی نظام قائم ہے، یہودی ابتک ارض موعودہ کی واپسی کے لیے دیوار گریہ پر روتے ہیں جتنی کہ بت پرست اپنی بت پرستی پر سختی سے قائم ہیں، اور اپنی تہذیب کا کوئی جزء بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اس کی فلسفیانہ توجیہیں کرتے ہیں، اس لیے اگر مسلمان اپنے مذہب میں پختگی دکھائیں تو اس کو تعصب پر محمول کیوں کیا جائے،

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

درحقیقت اس زمانہ میں مذہب کو مادی نظاموں سے بھی زیادہ غیر اہم بنا دیا گیا ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جب اور دنیاوی نظاموں میں اس کے بنیادی اصولوں سے انحراف کی اجازت نہیں تو مذہب میں اس کی آزادی کیوں ہو، اس معاملہ میں کمیونزم جو اس دور کا سب سے مقبول نظام ہے، سب سے زیادہ سخت ہے، کسی کمیونسٹ کو اس کے کسی جزء سے آزادی اور اختلاف کی اجازت نہیں، اس کی سزا کم سے کم پارٹی سے اخراج اور بعض حالتوں میں قتل یا جلاوطنی ہے، لیکن مذہب ہی ایسا گیا گذرا ہے کہ ہر آزادی کا مستحق ہے، الفاظ کا جادو بھی عجیب ہے، اس سے جو چیزیں ایک زمانہ میں خوبی و کمال سمجھی جاتی تھیں، عیب بن جاتی ہیں اور عیب برائی بن جاتے ہیں، چنانچہ اشراف طبقۂ اعلیٰ، جاگیردار، جاگیرداری اور سرمایہ داری

جو کسی زمانہ میں اعزاز اور امتیاز کے نشان تھے، آج کمیونزم کی اصطلاح میں تحقیر کی علامت بن گئے ہیں، چنانچہ کمیونزم کے مخالفین کو بورژوا، رجعت پسند اور سرمایہ داری کا ایجنٹ کہا جاتا ہے، جو کمیونزم کی اصطلاح میں بہت بڑی گالی ہے۔

گانے بجانے اور رقص و سرود کا پیشہ ایک زمانہ میں ایک خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص تھا، اور کم سے کم مسلمان اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، اور جن لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی، وہ بھی اس کو ثقاہت کے خلاف سمجھتے تھے، اب اس کو کلچرل پروگرام کے لقب سے معزز بنا دیا گیا ہے، جس میں بڑی بڑی شریف زادیاں اپنے کمالات دکھاتی ہیں، یہ تو ایک معمولی مثال ہے، آرٹ اور فنون لطیفہ کے نام سے مشرقی غیرت و حیا کے خلاف کیسی کیسی چیزیں رائج ہو گئی ہیں، اور فحاشیوں تک کو سند جواز مل گئی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک نئی اصطلاح قومی یکجہتی اور قومی دھارے میں بہنے کی نکلی ہے، جس کا مفہوم آج تک واضح نہ ہو سکا، اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے، اختلاف مذہب کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں، برادرانہ الفت و محبت کے ساتھ رہیں، آپس میں انسانی، وطنی اور معاشرتی حقوق و فرائض کا پورا لحاظ رکھیں، ملک کے مفاد میں متحد رہیں، اس کے لیے شانہ بشانہ مل کر کوشش کریں، اس کی خدمت میں کسی کا قدم پیچھے نہ رہے، اس قسم کا اتحاد و یکجہتی ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے ضروری ہے، اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر محب وطن کا فریضہ ہے،

لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ سب فرقے اپنے مذہبی اور تہذیبی امتیازات مٹا کر ایک رنگ میں رنگ جائیں، اور من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے، اس قسم کا اتحاد و یکجہتی نہ کوئی فرقہ گوارا کرے گا اور نہ عملاً ممکن ہے، کبیر، اکبر اور دارا شکوہ سے لیکر اس زمانہ تک اسکی جتنی کوششیں

ہوئیں سب ناکام رہیں، اور آیندہ بھی ناکام رہیں گی، مذہبی وحدت کا مطالبہ تو اس زمانہ میں کوئی بھی نہیں کرسکتا، مکمل تہذیبی وحدت بھی ممکن نہیں ہے، اگرچہ اصلاً اسلامی تہذیب اسلام سے الگ کوئی چیز نہیں، لیکن عربی اور دوسری تہذیبوں کے اختلاط سے ایک نئی تہذیب بن گئی ہے جس میں عربی، ایرانی اور ہندی سب تہذیبوں کے عناصر ہیں، یہی تہذیب صدیوں سے ہندو مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ستھرے طبقہ کی مشترک تہذیب تھی، اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ مشترک بھی تھی اور اس میں دونوں فرقوں کا کلچرل امتیاز بھی قائم تھا، ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ مشترک تہذیب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے، لیکن مسلمانوں میں اب تک قائم ہے، اور وہی ان کا امتیازی نشان رہ گئی ہے، اگر وہ بھی قومی اتحاد و یکجہتی کی نذر ہو جائے تو پھر مسلمانوں کی امتیازی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی، اسی طرح قومی اتحاد و یکجہتی کی سب سے بڑی نشانی اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ معلوم ہے

اس لیے اتحاد و یکجہتی اور قومی دھارے میں بہنے کا صحیح طریقہ اتحاد ہے، انضمام نہیں جسکی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اور جس کا عملی نمونہ ہندو مسلمان دونوں نان کوآپریشن کی تحریک میں پیش کرچکے ہیں، اس دور کے مسلمان لیڈر شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے نمائندے بھی تھے اور قومی اتحاد و یکجہتی کا نمونہ بھی، انکی مذہبیت ان کے حب وطن میں حائل نہ ہوسکی، انہی نے تحریک آزادی میں جان ڈالی تھی، اور انھوں نے وطن کی محبت اور خدمت اور اس کی راہ میں ایثار و قربانی کا وہ نمونہ پیش کیا، جو اس دور کے کٹر سے کٹر قوم پرور اور سیکولر مسلمان بھی نہیں پیش کرسکے، اور آج بھی قومی اتحاد و یکجہتی کا صحیح طریقہ یہی ہے، اس کے سوا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا، اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا،

یہ بحث مختلف قوموں کے درمیان تہذیبی اخذ و استفادہ اور اس کے حدود و شرائط سے شروع ہوئی تھی، درمیان میں ضمناً بعض اور باتیں بھی آگئیں، اس بحث کا یہ مقصد نہیں ہے کہ مسلمان اس ایٹمی دور میں پھر قرون وسطیٰ کی طرف لوٹ جائیں، جن چیزوں میں مغربی تہذیب سے استفادہ ضروری ہے، وہ تو مسلمہ حقیقت بن چکی ہے، اور اس پر ہر قوم عامل ہے، اس لیے وہ خارج از بحث ہے، بلکہ مغربی تہذیب کی جو چیزیں ہماری معاشرت کا جز بن چکی ہیں، مثلاً لباس، رہن سہن کے طریقے وغیرہ جن کی کسی خاص قوم کے ساتھ تخصیص نہیں رہ گئی ہے، ان کے متعلق بھی گفتگو نہیں ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب و روایات کے خلاف ہیں اور جن پر ہمارے ملی امتیاز اور تشخص کا دار و مدار ہے، ان میں کورانہ تقلید نہ کیجائے، مثلاً شرعی قوانین اور دینی و ملی شعائر کو مغربی قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہ کیجائے، گو زبان سے کوئی اس کا اقرار نہیں کرتا لیکن اصل مقصد و منشا یہی ہے، ورنہ پرسنل لا میں تبدیلی کا اس کے سوا کیا مقصد ہے؟ اس کے غلط استعمال نے جو خرابیاں پیدا کردی ہیں، ان کے ازالہ پر بعد میں بحث آئے گی

ہماری تقلید کا تو یہ حال ہے کہ یورپ کے مفکرین اور سماجی مصلحین تجربہ کے بعد جن چیزوں کو مغربی معاشرہ کے لیے مہلک سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف آوازیں بلند کرتے رہتے ہیں، ان میں بھی ہم پرانی لکیر کو پیٹتے چلے جاتے ہیں، مثلاً عورتوں کی بے مہار آزادی، مردوں سے بیباکانہ اختلاط، شوہروں سے بے نیازی، گھریلو ذمہ داریوں سے آزادی، کلب اور سیر سپاٹے کی زندگی جس نے یورپ کی خانگی زندگی کی مسرتوں کو ختم کر دیا ہے، اور میاں بیوی دونوں گھروں کے بجائے، بازاروں میں سکون تلاش کرتے ہیں، اور ان میں ایسی ایسی مضحکہ انگیز باتوں پر طلاق ہوتی ہے کہ ہم مشرقی ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے،

ہندوستانی عورت ابھی ترقی کی اس منزل پر تو نہیں پہنچی ہے، لیکن اس کے قدم تیزی سے اسکی طرف بڑھ رہے ہیں، اس کا مشاہدہ بڑے شہروں کی سوسائیٹیوں اور عورتوں اور مردوں کے مخلوط مجمعوں میں کیا جاسکتا ہے، جو حسن کا بازار اور دلبری و دلستانی کی نمایش گاہ معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے شرمناک نتائج ہوسٹلوں اور کالجوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، اس کے شرمناک واقعات آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں،

اب ہماری تعلیم گاہیں تعلیم و تربیت کا گہوارہ ہونے کے بجائے حسن و عشق کی درسگاہ بن گئے ہیں، بغیر کسی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دینے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے، اتفاق سے جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی تھیں، اخبارات میں مخلوط تعلیم کی مخالفت میں ایک امریکن ماہر تعلیم کا بیان نظر سے گذرا، سینما سے اصلاح و تربیت کا بھی کام لیا جاسکتا ہے، لیکن مذاق اتنا بگڑ گیا ہے کہ ہمارے نوجوان ان سے صرف عشق و عاشقی اور جرائم کا سبق سیکھتے ہیں جس کی تصدیق اخبارات سے ہوتی رہتی ہے، اس ماحول میں نوجوانوں کا بگڑنا تعجب انگیز نہیں، سلامت روی پر قائم رہنا تعجب انگیز ہے،

یہ تو صرف چند موٹی موٹی مثالیں دیگئیں، ورنہ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی حال ہے،

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم یورپ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوگئے ہیں لیکن ذہنی اور دماغی غلامی میں بدستور گرفتار ہیں، ہر چیز کو اسی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے اور اسیکے ساختہ دماغ سے سوچتے ہیں، خود ہمارے دماغوں سے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی ہے اور جن چیزوں کو تجدید و اصلاح کے نام سے پیش کیا جاتا ہے درحقیقت وہ بھی تقلید ہی ہے اور اس کی جو آواز بھی اٹھتی ہے وہ یورپ کی صدائے بازگشت ہے۔ اگر ہمارے متجددین ایکبات بھی اپنے دماغ سے کہتے تو بھی اس میں کچھ وزن ہوتا۔

تاہم اس سے انکار نہیں کہ بعض پرانے مسائل میں ترمیم اور نئے مسائل کا حل نکالنے کی ضرورت ہے، مگر اس کا معیار یہ نہیں ہے کہ یہ مسائل جدید رجحان کے خلاف ہیں، اس لیے ان میں ترمیم کیجائے، بلکہ یہ ہے کہ اس سے واقعی مسلمانوں کو دشواریاں پیش آتی ہیں یا کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے، اس قسم کے مسائل ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور اس دور کے علماء و مفکرین انکا حل نکالتے رہے ہیں، اس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ سے شروع ہوگیا تھا، پھر اس سلسلہ کے علما اور سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اپنے اپنے دائرہ میں نئے مسائل حل کیے، اب اس دور کے جو نئے مسائل ہیں اس زمانہ کے علماء کو ان کا حل نکالنا ہے، اب تک اس میں دو رکاوٹیں رہی ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی نظام نہیں ہے، جو اس قسم کے کاموں کو انجام دے سکے، اگر امارت شرعیہ بہار کے طرز پر پورے ہندوستان میں ایک وسیع اور مؤثر نظام قائم ہوجائے جس کو سارے مسلمان مان لیں اور اس کے فیصلوں کو عدالت کے فیصلوں کی طرح تسلیم کریں، تو بہت سی مشکلات دور ہوجائیں، دوسرا سبب تقلید جامد ہے، ہمارے علماء نئے مسائل میں جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے جھجکتے ہیں، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح علمائے قدیم نے اپنے دور کے مسائل حل کیے، اس زمانہ کے علماء موجودہ دور کے مسائل کو حل نہ کر سکیں، بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ اگر ان میں کسی خاص مکتب فقہ کی پابندی ضروری نہ سمجھی جائے تو کسی نہ کسی مکتب فقہ میں انکا حل نکل آئے گا، اور جو اس سے حل نہ ہوسکیں تو کتاب و سنت، استنباط مسائل کے شرعی اصولوں اور گذشتہ نظائر کی روشنی میں ان کا حل نکالا جائے، اس لیے جس طرح علماء نے پرسنل لا کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اسی طرح دوسرے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے،

جو طبقہ اس مطالبہ میں زیادہ سرگرم ہے وہ مبہم باتیں کہتا ہے، یہ نہیں بتاتا کہ پرانے

کن مسائل میں کس قسم کی ترمیم اور نئے مسائل کا کس قسم کا حل چاہتا ہے، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو علانیہ شرعی قوانین کو مغربی انداز میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ تو خارج از بحث ہیں لیکن کچھ مخلصین ہیں جو مسلمانوں کی خیرخواہی میں اس دور کی مشکلات اور مسائل کا حل چاہتے ہیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کے مسائل کی ایک فہرست تیار کیجائے اور جو مسئلہ جس دائرے سے تعلق رکھتا ہو اسکے ماہرین اور علما، مل کر اسکے حل کرنے کی کوشش کریں،

یہ مسائل کسی خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ عالمگیر ہیں، اور اسلامی ملکوں نے ان کو حل کیا ہے، بعض نے تو مغربی قوانین کی کورانہ تقلید کی ہے، اور بعض نے شریعت کے اصولوں کی روشنی میں ان کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے مجموعے مرتب کیے ہیں اور مصر کے علما، نے فقہ جدید پر کتابیں لکھی ہیں، خود ہندوستان کے علما، نے ان پر مضامین اور کتابیں لکھی ہیں، اس لیے اب ان مسائل کا حل زیادہ دشوار نہیں ہے، دار العلوم ندوۃ العلما، کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے، مگر اس سے زیادہ وسیع پیمانہ اور اجتماعی طریقہ پر اس کام کو انجام دینے کی ضرورت ہے، ورنہ زمانہ خود اپنے ذوق و رجحان کے مطابق ان کو حل کرے گا، جس کی ذمہ داری علما، پر ہوگی۔

دین رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کیلیے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات اور احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، مرز و بوم، قوم و ملک، مشرق و مغرب تمام انسانوں کیلئے سراپا رحمت ہے، اس میں انسانوں کے ہر طبقہ بلکہ حیوانات تک کے حقوق کے متعلق اسلام کی تعلیمات تفصیل سے پیش کی گئی ہیں۔

مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۳ے

حدیث کا درایتی معیار

داخلی نقد حدیث

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۳)

چند موضوع حدیثیں

یقول (النبطی) قتلة الانبیاء واعوان الظلمة فاذا اتخذن والرباع وشیدوا البنیان فالھرب الھرب[1]	رسول اللہ صلعم فرماتے تھے کہ نبطی تو م نبیوں کے قاتل اور ظالموں کے مددگار ہیں، جب وہ حویلی بنانے لگیں اور عمارت مضبوط کرنے لگیں تو ان سے بھاگو،
اربع مدائن من مدن النار فی الدنیا القسطنطنیہ والطبریۃ وانطاکیۃ المحترقۃ وصنعا[2]	چار شہر دوزخ کے شہروں میں سے ہیں (۱) قسطنطنیہ (۲) طبریہ (۳) جلا ہوا انطاکیہ اور (۴) صنعاء۔
لو علم اللہ فی الخصیان خیراً لاخرج من اصلابھم ذریۃ یعبدون اللہ[3]	اگر اللہ تعالیٰ خصی (ہیجڑا) میں خیر و بھلائی جانتا تو ان کی پشت سے ایسی اولاد نکالتا جو اللہ کی عبادت کرتے۔
شر المال فی آخر الزمان المالیک[4]	آخر زمانہ میں بدترین مال غلام ہونگے۔

---

[1] جلال الدین السیوطی، اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ، باب بقیۃ المناقب [2] ایضاً مناقب والایام [3] المنار المنیف فصل ۲۵ [4] موضوعات کبیر ص ۱۲۳ مطبع مجتبائی

رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں جو رسول اللہ صلعم کی شان سے بعید ہوں۔

اشتمالہ علی امثال ھذہ المجازفات التی لا یقول مثلہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]	رسول اللہ علیہ وسلم کی حدیث ایسی بیڈھنگی باتوں پر مشتمل ہو جو آپ کی زبان سے نہیں نکل سکتی ہیں،

عربی کا محاورہ ہے "جازف فی کلامہ" یعنی۔

تکلم من غیر قانون و بدون تبصر[2]	قاعدہ قانون اور سمجھ بوجھ کا لحاظ کیے بغیر بات کہہ دی

اسکے تحت چند موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع ہیں:۔

من قال لا الہ الا اللہ خلق اللہ من تلک الکلمۃ طائرا لہ سبعون الف لسان لکل لسان سبعون الف لغۃ یستغفرون اللہ[3]	جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اللہ تعالی اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرے گا جس کے ستر ہزار زبانیں ہونگی، ہر زبان کی ستر ہزار لغت ہوں گی اور وہ استغفار کریں گی۔

یا مثلاً جس شخص نے فلاں کام کیا اس کے لیے ستر ہزار شہر ہوں گے، ہر شہر میں ستر ہزار محل ہوں گے اور ہر محل میں ستر ہزار حوریں ہوں گی۔[4]

من ترک الصلوۃ حتی مضی وقتہا ثم قضی عذب فی النار حقبا	جس شخص نے نماز چھوڑ دی یہاں تک کہ اس کا وقت گذر گیا، پھر قضا کی تو اسکو

[1] المنار المنیف فصل ۷، موضوعات کبیر ص۱۱ مطبع مجتبائی [2] المنجد [3] موضوعات کبیر ص۱۱

والحقب ثمانون سنۃ والسنۃ ثلثمائۃ وستون یوما کل یوم مقدارہ الف سنۃ[1]	ایک "حقب" آگ کا عذاب دیا جائے گا، "حقب" اسی سال کا ہوتا ہے اور ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے اور (قیامت کے) ہر دن کی مقدار ایک ہزار سال کی ہے،

اس لحاظ سے دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کی سزا صرف ایک وقت کی نماز چھوڑ دینے سے ہوئی وہ بھی جس کی قضا پڑھ لی گئی ہو،

رکعتان من العاقل افضل من سبعین رکعۃ من الجاہل ولو قلت سبعمائۃ رکعۃ لکان کذالک[2]	عاقل کی دو رکعتیں جاہل کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں، اور اگر میں سات سو کہوں تو وہ بھی درست ہے۔
اعتبروا عقل الرجل فی طول لحیتہ ونقش خاتمہ وکنیتہ[3]	داڑھی کی لمبائی، انگوٹھی کے نقش اور کنیت سے آدمی کے عقل کا اندازہ کرو۔ جس
من شم الورد ولم یصل علی فقد جفانی[4]	شخص نے گلاب کا پھول سونگھا اور میرے اوپر درود نہیں بھیجا اس نے میرے اوپر ظلم کیا،
من قال فی کل یوم ثلاث مرات صلوات اللہ علی آدم غفر اللہ لہ الذنوب وان کانت اکثر من زبد البحر وکان فی الجنۃ رفیق آدم[5]	جس نے ہر دن تین مرتبہ صلوات اللہ علی آدم کہا تو اللہ اس کے گناہوں کو بخش دیگا اگرچہ وہ گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں اور جنت میں وہ آدم کا رفیق ہوگا۔

[1] مجالس الابرار المجلس الحادی والخمسون [2] تذکرۃ الموضوعات باب العقل والبلادہ [3] ایضاً [4] ایضاً باب فضل الصلوٰۃ [5] ایضاً باب فضل الصلوٰۃ وکتابتہا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں لغویت اور تمسخر اور کم عقلی و بے توفی کی بات پائی جائے	جس حدیث میں ایسی لغویت و تمسخر اور کم عقلی و بے توفی کی بات پائی جائے جس سے ذمہ دار لوگ پرہیز کرتے ہیں۔
سماجۃ الحدیث وکونہ مما یسخر منہ[1]	حدیث میں لغویت اور ایسی بات ہو کہ جس سے تمسخر کیا جاتا ہے،
اسکے تحت چند موضوع حدیثیں	اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں،
لو کان الارز رجلا لکان حلیما ما اکلہ جائع الا اشبعہ[2]	اگر چاول مرد ہوتا تو وہ بردبار ہوتا، جو بھوکا بھی اسکو کھاتا شکم سیر ہو جاتا،
فضل دھن البنفسج علی الادھان کفضل اھل البیت علی سائر الخلق[3]	بنفشہ کے تیل کی فضیلت دوسرے تیلوں پر ایسی ہے جیسی اہلبیت کی فضیلت تمام مخلوق پر ہے۔
نقطۃ من دواۃ عالم احب الی اللہ من عرق مائۃ اثواب شہید[4]	عالم کی دوات کا ایک نقطہ اللہ کو شہید کے سو کپڑوں کے پسینہ سے زیادہ محبوب ہے۔
لا تقولوا قوس قزح فان قزح ھو الشیطان لکن قولوا قوس اللہ فھو امان لاھل الارض من الغرق[5]،	قوس قزح نہ کہو کیونکہ قزح شیطان ہے قوس اللہ کہو کہ اسکے ذریعہ غرق سے اہل زمین کی حفاظت ہوتی ہے۔

[1] المنار المنیف فصل ۸ موضوعات کبیر ۱۱۱ [2] تذکرۃ الموضوعات باب المحبوب من العدس۔
[3] المنار المنیف فصل ۸ [4] تذکرۃ الموضوعات باب فی من ادعی الصحبۃ [5] محمد بن شوکانی۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ خاتمۃ فی احادیث متفرقۃ

لا تضربوا اولادکم علی بکائھم فبکاء الصبی اربعۃ اشھر شھادۃ ان لا الہ الا اللہ واربعۃ اشھر الصلوٰۃ علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم واربعۃ اشھر دعاء لوالدیہ[1]	اپنی اولاد کو رونے پر نہ مارو چار مہینے تک بچے کے رونے میں لا الہ الا اللہ کی شہادت ہوتی ہے، اور چار مہینے تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے اور چار مہینے تک اپنے والدین کے لیے دعا کرتا ہے۔
ان لابراھیم الخلیل ولابی بکر الصدیق لحیۃ فی الجنۃ[2]	جنت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ابوبکر صدیق کی داڑھی ہوگی،
نبات الشعر فی الانف امان من الجذام[3]۔	ناک میں بال اگنا جذام سے امن کی علامت ہے،
انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا بلغہ عن احد من اصحابہ شدۃ عبادۃ یسأل کیف عقلہ فان قالوا حسن قال ارجوہ واذا قالوا غیر ذلک قال لو یبلغ صاحبک حیث تظنون[4]	رسول اللہ کو جب آپکے صحابیوں میں سے کسی کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ بہت عبادت کرتا ہے تو اس کی عقل کے بارے میں معلوم کرتے اگر کہا جاتا کہ عقل ٹھیک ہے تو فرماتے کہ میں خیر کی امید کرتا ہوں، اور اگر کہا جاتا کہ ٹھیک نہیں ہے تو فرماتے کہ کاش تمہارا ساتھی ان کے عمل تک پہنچ جاتا۔
ان للقلب فرحۃ عند اکل اللحم[5]	گوشت کھانے کے وقت قلب کو فرحت ہوتی ہے۔

[1] محمد بن شوکانی: الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ خاتمۃ فی احادیث متفرقۃ [2] علامہ سخاوی المقاصد الحسنۃ حرف الہمزہ [3] محمد بن شوکانی الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ خاتمۃ فی ذکر احادیث متفرقۃ۔
[4] ایضاً [5] المنار المنیف فصل ۸۔

ذرۃ من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال الظاھر[۱]	باطنی اعمال کا ایک ذرہ ظاہری اعمال کے اونچے اور مضبوط پہاڑ سے بہتر ہے۔
علیکم بالملح فانہ شفاء من کل داء[۲]	نمک ضرور کھاؤ اس میں ہر بیماری کی شفاء ہے۔

مذکورہ مجازفات (بے ڈھنگا پن) اور سماجت (لغویت) کے تحت یہ بھی آتا ہے کہ

رسول اللہ کی پیدائش کے واقعہ میں شان نبوت پہ حرف آئے اور معیار نبوت برقرار نہ رہے

(۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے واقعہ کی تشریح اس انداز سے ہو کہ نبوت پر حرف آئے، اور معیار نبوت برقرار نہ رہے، جیسا کہ حضرت آمنہ سے منقول ہے۔

"جس وقت میں حاملہ ہوئی تو پیدائش کے وقت تک میں کسی قسم کی تکلیف (جو دوسری عورتوں کو ہوتی ہے) میں مبتلا نہیں ہوئی۔"

"پیدائش کے بعد آپ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور آپ کے ساتھ ایک نور نکلا جس نے مشرق و مغرب کو روشن کر دیا، میں نے اس کے ذریعہ شام کے محلات دیکھے یہاں تک کہ بصریٰ میں اونٹوں کو سر اٹھائے ہوئے دیکھا۔"[۳]

"مجھے یہ بشارت دی گئی کہ تو "خیر الثقلین" کے ساتھ حاملہ ہے اور پیدائش کے بعد اسکا نام محمدؐ رکھنا۔"

"مجھے سفید شربت پیش کیا گیا جو شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔"

"پرندوں کے ایک جھنڈ نے میرے حجرے کو ڈھک لیا جس کی "زمرد" کی چونچ تھی اور "یاقوت"

---

[۱] تذکرۃ الموضوعات باب خرقۃ الصوفیہ الخ [۲] المنار المنیف فصل ۸ [۳] ابن عساکر الشافعی تاریخ ابن عساکر باب ذکر مولد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور ندا آئی کہ اس کو مشرق و مغرب کی سیر کرا دو تاکہ سب لوگ پہچان لیں۔"

"پیدائش کے وقت ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگورے گر گئے، آتش فارس بجھ گئی جو ایک ہزار سال سے نہ بجھی تھی اور بحیرہ طبریہ خشک ہو گیا وغیرہ"[۱]

اس قسم کی روایتیں تاریخ و سیر کی کتابوں میں ملتی ہیں مگر حدیث کی مستند کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں داخلی نقد حدیث کے اصول بالعموم نظر انداز کر دیے گئے ہیں، پھر رسول اللہؐ کی پیدائش کے وقت کوئی صحابی موجود نہ تھا جس کی روایت قابل قبول ہو، ایسی حالت میں یہ روایتیں یا عوامی شہرت کی بنا پر ہوں گی یا رسول اللہؐ نے خود اس کی وضاحت فرمائی ہو گی، اگر ان واقعات کی شہرت اس طرح ہوتی جیسی ان روایتوں سے ظاہر ہوتی ہے تو بعد میں رسول اللہؐ کو تبلیغ رسالت میں جس قدر دشواریاں پیش آئیں وہ نہ پیش آتیں، اور ہر شخص ان واقعات کی شہرت کی بنا پر ایمان لانے پر مجبور ہوتا، اور اگر رسول اللہؐ نے بنفس نفیس ان کی وضاحت فرمائی ہوتی تو اتنے اہم واقعات کا تذکرہ حدیث کے مستند ذخیروں میں ضرور ہوتا، یہ کیسے ممکن ہو کہ آپ کی پیدائش کے وقت کے ان دلائل نبوت کو محدثین ۔۔۔ نظر انداز کر دیتے۔

پھر تاریخ و سیر کی کتابوں میں ان واقعات کا جس انداز سے ذکر ہے، ایک معمولی آدمی بھی اپنی پیدائش کے واقعات اس طرح بیان کرنا پسند نہیں کرتا، چہ جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اس سے ارفع و اعلیٰ تھی۔

---

[۱] محمد بن عبد الباقی الزرقانی، شرح المواہب اللدنیہ ج ۱، المقصد الاول باب فی تشریف اللہ تعالیٰ لہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو، چہ جائیکہ رسول اللہ کا کلام جس کو مختلف وجوہ سے فوقیت حاصل ہے،

ان یکون کلامہ لا یشبہ	آپ کی طرف منسوب کلام نبیوں کے
کلام الانبیاء فضلاً عن کلام	کلام کے مشابہ نہ ہو چہ جائیکہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۱]	کا کلام،

آدمؑ کے قبول توبہ کا ایک موضوع واقعہ

مثلاً آدمؑ کے قبول توبہ کا واقعہ،

لما اقترف آدم الخطیئۃ قال	جب حضرت آدمؑ سے غلطی سرزد ہوگئی تو انھوں نے
یا رب اسئلک بحق محمد لما	عرض کیا کہ اے اللہ میں آپ کو محمد کا واسطہ دیتا
غفرت لی قال وکیف عرفت	ہوں کہ آپ میری خطا معاف فرما دیں، اللہ
محمداً قال لانک خلقتنی	نے فرمایا کہ تم نے محمدؐ کو کیسے جانا، حضرت آدمؑ نے
بیدک ونفخت فی من روحک	جواب دیا کہ جب آپ نے مجھ کو پیدا کیا اور مجھ میں اپنا
رفعت رأسی فرأیت علی قوائم	روح سے (کچھ) پھونکدیا تو میں نے سر اٹھا کر عرش
العرش مکتوباً لا الہ الا اللہ	کے پایوں پر نظر ڈالی تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
محمد رسول اللہ فعلمت انک	لکھا ہوا دیکھا، اس سے میں نے سمجھ لیا کہ آپ نے
لم تضیف الی اسمک الا احب	اپنے نام کے ساتھ جس کا نام شامل کیا ہے وہ
الخلق الیک قال صدقت	یقیناً آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہوگا، اللہ نے
یا آدم ولولا محمد ما خلقتک [۲]	فرمایا آدم تم نے سچ کہا، اگر محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو بھی

[۱] المنار المنیف فصل ۱۲، وموضوعات کبیر ص ۱۱۰ [۲] حاکم مستدرک باب استغفار آدم علیہ السلام بحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"حاکم" نے اس حدیث کو "صحیح" قرار دیا ہے لیکن اس میں عبدالرحمن بن زید بن اسلم راوی بالاتفاق ضعیف ہے، غالباً اسی بنا پر ابن تیمیہؒ نے حدیث نقل کرنے کے بعد کہا ہے،

واما تصحیح الحاکم مثل ہذا الحدیث	حاکم کے اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنے پر
وامثالہ فہذا مما انکر علیہ	ائمۂ حدیث نے نکیر کی ہے، اور کہا ہے کہ
ائمۃ العلم بالحدیث فقالوا	حاکم بہت سی ان حدیثوں کو صحیح کہتے
ان الحاکم یصحح احادیث وہو	ہیں جو ماہرین حدیث کے نزدیک موضوع
موضوعۃ مکذوبۃ عند اہل	اور جھوٹی ہوتی ہیں،
المعرفۃ بالحدیث [۱]	

اسی طرح حضرت آدمؑ کے رونے سے متعلق روایتیں کہ تمام آدمیوں کا رونا جمع کیا جائے تو بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا یا انکے آنسوؤں کو اولاد آدم کے آنسوؤں سے وزن کیا جائے تو آدمؑ کے آنسو کا پلہ جھک جائے وغیرہ،

عرش معلی پر جانے کی روایت موضوع ہے

یا معراج کے واقعہ میں یہ حدیث کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج تشریف لے گئے اور عرش معلی تک پہنچے، تو آپ نے نعلین مبارک اتارنے کا ارادہ کیا (جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی مقدس طویٰ میں اتارا تھا) تو ندا آئی

یا محمد لا تخلع نعلیک فان	اے محمد! آپ نعلین نہ اتاریے
العرش یتشرف بقدومک	عرش آپ کے نعلین پہنکر آنے سے
متنعلا [۲]	شرف حاصل کرے گا،

[۱] ابن تیمیہ کتاب التوسل سوال آدم بحق محمدؐ [۲] مولانا عبدالحیٔ لکھنوی. الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعۃ ص ۲۶۷

احمد مغربی مالکی نے اپنی کتاب "فتح المتعال فی مدح خیر النعال" میں اس پورے قصہ کو موضوع قرار دیا ہے، کیونکہ معراج کی کسی مستند روایت سے نہ عرش پر جانا ثابت ہے اور نہ جوتا پہنکر تشریف لے جانا، [5]

علم و حسن سے متعلق بعض موضوع روایتیں

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و حسن سے متعلق بعض روایتیں کہ آپ کو پیدائش ہی کے وقت سے پورے قرآن کا علم تھا حضرت جبریلؑ کے جواب میں آپ کے "ما انا بقاری" (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) فرمانے کا مطلب یہ تھا،

لا اقرأ بامرك فاني عالم به قارئ من قبل [6]

میں آپ کے حکم سے نہ پڑھوں گا کیونکہ میں پہلے ہی سے عالم وقاری ہوں،

اسی طرح یہ واقعہ کہ

انه في ليلة من الليالي سقطت من يد عائشة ابرتة فقدت فالتمستها ولم تجد فضحك النبي صلى الله عليه وسلم وخرجت لمعة اسنانه فاضاءت الحجرة ورأت عائشة بذلك الضوء ابرتة [7]

ایک رات حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے سوئی گر گئی اور تلاش کرنے کے باوجود نہ مل سکی، اس پر رسول اللہ ﷺ کو ہنسی آئی، اور آپ کے دانتوں کی چمک سے حجرہ اتنا روشن ہو گیا کہ سوئی مل گئی،

اس قسم کی اور روایتیں بھی ہیں جن کو واعظ اور میلاد خواں بیان کرتے ہیں اگرچہ ان کا تذکرہ تاریخ وسیر کی کتابوں میں ہے لیکن روایۃً و درایۃً وہ موضوع ہیں، [8]

---

[5] الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة ص ۲۶۷ [6] ایضاً ص ۶۹ ، [7] ایضاً ص ۲۶۵
[8] ایضاً

خرقۂ صوفیہ کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح نہیں ہے،

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خرقۂ صوفیہ کی نسبت، محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی کہتے ہیں

انه ليس في شيء من طرقها ما يثبت ولم يرد في خبر صحيح ولا حسن ولا ضعيف ان النبي صلى الله عليه وسلم البس الخرقة على الصورة المتعارفة بين الصوفية لاحد من اصحابه ولا امر احدا من اصحابه يفعل ذلك وكل ما يروى في ذلك صريحا فباطل [1]

صوفیہ میں خرقہ پہنانے کی جو صورتیں متعارف ہیں ان کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو خرقہ پہنانا، (ان کو ایسا کرنے کا حکم دینا کسی صحیح حسن اور ضعیف روایت سے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اس سلسلہ میں روایت کیا جاتا ہے وہ سب صراحۃً باطل ہے،

حضرت علیؓ کا حضرت حسن بصری کو خرقہ پہنانا ثابت نہیں ہے

اسی طرح حضرت علیؓ کا حضرت حسن بصری کو خرقہ پہنانا بھی ثابت نہیں ہے،

فان ائمة الحديث لم يثبتوا للحسن من علي سماعا فضلا عن ان يلبسه [2]

ائمۂ حدیث کے نزدیک حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصری کا سماع (ملاقات) بھی ثابت نہیں ہے، خرقہ پہنانا تو دور کی بات ہے،

فقراء صوفیہ سے متعلق بعض موضوع روایتیں

اسی طرح فقراء صوفیاء سے متعلق یہ حدیثیں بھی موضوع ہیں،

حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء کی

---

[1] محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی: المقاصد الحسنة [2] ایضاً

جلس للفقراء ورقص حتی شق قمیصه[1]	مجلس میں تشریف لائے اور رقص کیا یہانتک کہ اپنی قمیص پھاڑ ڈالی،
اتخذوا مع الفقراء ایادی فان لھم دولة یوم القیمة[2]	فقراء کے ساتھ احسان کرو (کیا مت) کے دن ان کے پاس دولت ہوگی،
من اکل مع مغفور له غفر له[3]	جس شخص نے اس شخص کیساتھ کھایا جسکی مغفرت (کیگئی)
من سرّه ان یجلس مع الله فلیجلس مع اهل التصوف[4]	جو شخص اللہ کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتا ہے اس کو صوفیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے،

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث فی نفسہ باطل ہو

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث ایسی کھلی ہوئی باطل ہو کہ اس کا بطلان خود دلالت کرتا ہو کہ یہ اللہ کے رسولؐ کا کلام نہیں ہو سکتا،

ان یکون الحدیث باطلاً فی نفسه فیدل بطلانه علی انه لیس من کلام الرسول صلی اللہ علیه وسلم[5]	حدیث فی نفسہ ایسی باطل ہو جس کا بطلان دلالت کرتا ہو کہ یہ رسول اللہؐ کا کلام نہیں ہو سکتا،

اس اصول کے تحت چند موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

ابغض الکلام الی اللہ تعالیٰ الفارسیة وکلام الشیطان	اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ کلام فارسی ہے، اور شیطان کا کلام

[1,2,3] ابن قیم المنار المنیف فصل ۱۱ [4] تذکرۃ الموضوعات باب اللباس الخ [5] ملا علی قاری موضوعات کبیر ص ۱۱۳ و ابن قیم المنار المنیف فصل ۱۱

الخوزیة وکلام اهل النار النجاریة[1]	خوزیوں (ایک قبیلہ) کا کلام ہے اور دوزخیوں کا کلام، نجاریوں کا کلام ہے،
ان اللہ تعالیٰ اذا رضی انزل الوحی بالعربیة واذا غضب انزل الوحی بالفارسیة[2]	اللہ جب خوش ہوتا ہے تو عربی زبان میں وحی اتارتا ہے اور جب ناراض ہوتا ہے تو فارسی زبان میں وحی اتارتا ہے،
من تکلم بالفارسیة زادت فی خسته ونقصت من مروته[3]	جو شخص فارسی زبان میں گفتگو کرتا ہے اسکی دنارت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اسکی شرافت میں کمی آجاتی ہے،
ست خصال تورث النسیان اکل سور الفار والقاء القمل فی النار وهی حیة والبول فی الماء الراکد وقطع القطار ومضغ العلك واکل التفاح الحامض[4]	چھ چیزیں نسیان پیدا کرتی ہیں (۱) چوہے کا جھوٹا کھانا (۲) آگ میں زندہ جوں ڈالنا (۳) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا (۴) اونٹ کی قطار کے درمیان سے نکلنا (۵) گوند چبانا (۶) کھٹا سیب کھانا۔
الحجامة علی القفا تورث النسیان[5]	گدی پر پچھنا لگانا نسیان پیدا کرتا ہے،
یا حمیراء لا تغتسلی بالماء المشمس فانه یورث البرص[6]	اے عائشہ سورج سے گرم پانی سے غسل نہ کیا کرو اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔
آلیت علی نفسی ان لا یدخل	میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جس کا نام احمد یا محمد

[1,2,3] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات باب مدح العرب ولغتھم [4] العجلونی کشف الخفاء، ص ۴۴۷ [5] المنار المنیف فصل ۱۱ [6] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۳

النار من اسمه احمد محمد[1]

ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔

من ولد له مولود فسماه محمد تبرکا به کان هو والوالد فی الجنة[2]

جس شخص کے لڑکا پیدا ہوا اور اس نے برکت حاصل کرنے کے لیے اس کا نام محمدؐ رکھا تو لڑکا اور باپ دونوں جنت میں جائیں گے۔

ما من مسلم دنا من زوجته وهو ینوی ان حبلت منه ان یسمیه محمدا الا رزقه الله ذکرا[3]

جو مسلمان اپنی بیوی کے پاس اس نیت سے گیا کہ اس سے جو حمل ہوگا اس کا نام محمد رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو لڑکا عطا کرے گا۔

ما من عبد یبکی یوم قتل حسین الا کان یوم القیمة مع اولی العزم من الرسل[4]

اللہ کا جو بندہ شہادت حسینؓ کے دن روئے گا قیامت کے دن اس کا حشر اولوالعزم رسولوں کے ساتھ ہوگا۔

لو احسن احد کم ظنه بحجر لنفعه[5]

تم میں سے جو شخص پتھر کے ساتھ بھی حسن ظن رکھے گا تو وہ اس کو نفع دیگا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث محسوس عالم، مشاہدہ اور عادت کے خلاف

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث محسوس عالم، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو۔ ابوالحسن علی ابن محمد کنانی کہتے ہیں۔

---

[1] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] تذکرۃ الموضوعات فمن ادعی الصحبۃ کذباً [5] المنار المنیف فصل ۴۹

ویلتحق به ما یدفعه الحس والمشاهدة او العادة[1]

اس کا کت میں وہ حدیثیں بھی آتی ہیں جو حس، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہوں۔

علامہ سخاویؒ کہتے ہیں:

او یکون مما یدفعه الحس والمشاهدة[2]

یا ایسی حدیثیں ہوں جن کو حس اور مشاہدہ قبول نہ کرے۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پائی ہیں،

السواک یزید الرجل فصاحة[3]

مسواک سے فصاحت میں زیادتی ہوتی ہے،

اذا عطس الرجل عند الحدیث فهو صدق[4]

جب بات کے وقت آدمی چھینکے تو وہ سچا ہے،

من قارف ذنبا فارقه عقل لم یعد الیه[5]

جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اسکی عقل اس سے جدا ہو جاتی ہے اور پھر نہیں لوٹتی ہے،

ایک شخص نے اولاد کم ہونے کی شکایت کی تو رسول اللہؐ نے اس کو پیاز اور انڈا کھانے کا حکم دیا، اس نے پوچھا کس کے انڈے کھائے جائیں، آپؐ نے جواب میں فرمایا

کل بیض ولو بیض النمل[6]

ہر انڈا خواہ چیونٹیوں کا ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] ابوالحسن علی کنانی: تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ فصل فی امارات الموضوع الخ [2] فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث الموضوع [3] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات باب خصال الوضوء الخ [4] موضوعات کبیر فصل ولحن تنبیہ الخ [5] تذکرۃ الموضوعات باب خصال الوضوء الخ [6] ایضاً فصل السعی فی الاولاد

النطفة التی تخلق منها الولد ترعد لها الاعضاء والعروق کلها اذا خرجت ووقعت فی الرحم[1]

جس نطفہ سے لڑکا پیدا ہوتا ہے جب نکل کر رحم میں گرتا ہے تو تمام اعضا اور عروق میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان یمن المرأة تبکیرها بالانثی[2]

عورت کی برکت پہلے لڑکی جننا ہے۔

اشربوا علی الطعام تشبعوا[3]

کھانے پر پانی پی لیا کرو سیراب ہو جاؤ گے،

لا یفعلن احدکم امراً حتی یستشیر فان لم یجد من یستشیره فلیستشیر امرأة ثم یخالفها فان فی خلافها البرکة[4]

تم میں سے کوئی شخص کوئی کام مشورہ کیے بغیر نہ کرے، اگر مشورہ دینے والا نہ ملے تو عورت سے مشورہ کرے، پھر اس کے خلاف کرے، کیونکہ عورت کے خلاف کرنے میں برکت ہے،

شرارکم عزابکم[5]

تم میں بدترین غیر شادی شدہ لوگ ہیں،

رکعتان من المتزوج افضل من سبعین رکعة من الاعزب[6]

شادی شدہ کی دو رکعتیں غیر شادی شدہ کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں،

اسی طرح غیر شادی شدہ لوگوں کی فضیلت سے جس قدر حدیثیں ہیں، سب موضوع ہیں،[7]

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو

(۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو یعنی فرد واحد یا کسی خاص طبقہ کی عقل کے خلاف نہیں، بلکہ عام طور پر لوگ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں،

---

[1] تذکرۃ الموضوعات فصل السعی فی الاولاد [2] موضوعات کبیر ص ۱۱۱ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الموضوعات باب تادیب النساء، الخ [5] ایضاً فضل النکاح الخ [6] المنار المنیف فصل ۴۲

ابن جوزیؒ کہتے ہیں

کل حدیث رأیته یخالف المعقول .... فاعلم انه موضوع فلا تتکلف اعتباره[1]

ہر وہ حدیث جس کو تم معقول (عقل) کے مخالف .... دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

مختلف محدثین نے ابن جوزیؒ ہی کے حوالہ سے یہ اصول نقل کیا ہے، علامہ سخاویؒ اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں،

ای لا تعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم[2]

یعنی ایسی حدیث کے راویوں کا اعتبار ہوگا اور نہ ان کی جرح میں نظر کی جائے گی (اس کے بغیر ہی وہ رد ہو جائے گی)

اسکی مزید وضاحت ابن جوزی کی اس عبارت سے ہوتی ہے،

الا تری انه لو اجتمع خلق من الثقات فاخبروا ان الجمل قد دخل فی سم الخیاط لما نفعتنا ثقتهم ولا اثرت فی خبرهم لانهم اخبروا بمستحیل[3]

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اگر ثقہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت خبر دے کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو گیا تو نہ ان کی ثقاہت ہمیں نفع دے گی اور نہ ان کی خبر ہی ... اثر کرے گی، کیونکہ انھوں نے امر محال کی خبر دی ہے۔

---

[1] عبدالرحمٰن بن علی بن جوزی، کتاب الموضوعات، کتاب التوحید، باب فی ان اللہ عز وجل قدیم [2] فتح المغیث۔ الموضوع [3] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات، کتاب التوحید

اس اصول کے تحت وہ حدیثیں موضوع قرار پائیں گی جو عقل کی عمومی سطح کے خلاف ہوں، خصوصی سطح کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ اس کی بنیاد پر حدیث کے بارے میں فیصلہ ممکن ہے، چنانچہ

ان یکون الحدیث مخالفا البدیہیات العقول من غیر ان یمکن تاویلہ[1]	حدیث عقل کی بدیہیات کے خلاف ہو جس کی تاویل ممکن نہ ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع ہونگی،

ان سفینۃ نوح طافت بالبیت سبعا وصلت عند المقام رکعتین[2]	حضرت نوحؑ کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھی،
طول اللحیۃ دلیل قلۃ العقل[3]	داڑھی کی درازی کم عقلی کی دلیل ہے،
ان الورد خلق من عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم او من عرق البراق[4]	گلاب کا پھول رسول اللہ یا براق کے پسینہ سے پیدا کیا گیا،
الورد الابیض خلق من عرقی لیلۃ المعراج والورد الاحمر خلق من عرق جبرئیل	سفید گلاب معراج کی رات میرے پسینہ سے پیدا کیا گیا، سرخ گلاب جبرئیلؑ کے پسینہ سے اور زرد گلاب

۱؎ مصطفیٰ سباعی۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ علامات الوضع فی المتن

۳؎ المقاصد الحسنۃ حرف الطاء، ۴؎ ایضاً حرف الہمزہ

والورد الاصفر من عرق البراق[1]	براق کے پسینہ سے پیدا کیا گیا۔
الجوز دواء والجبن داء فاذا صار فی الجوف صار شفاء[2]	اخروٹ دوا ہے اور پنیر بیماری ہے، جب وہ پیٹ میں جاتی ہے تو شفاء بن جاتی ہے،
من لم یکن لہ مال یتصدق بہ فلیلعن الیہود والنصاری[3]	جس شخص کے پاس مال خیرات کرنے کے لیے نہ ہو تو اس کو یہود و نصاریٰ پر لعنت کرنی چاہیے،
من اخذ لقمۃ اوکسرۃ من مجری الغائط والبول فاماط عنہا الاذی وغسلہا غسلا نقیا ثم اکلہا لم یستقر فی بطنہ حتی یغفر لہ[4]	جس شخص نے ایک لقمہ یا ٹکڑا پاخانہ یا پیشاب کی نالی سے اٹھایا اور اس سے گندگی دور کرکے خوب دھویا پھر کھا لیا تو پیٹ میں جانے کے ساتھ ہی اس کی مغفرت ہو جائے گی
لا تقطعوا اللحم بالسکین فان ذالک من صنیع الاعاجم[5]	گوشت کو چھری سے نہ کاٹو کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔
من طول شاربہ فی الدنیا	جس شخص نے دنیا میں اپنی مونچھیں

۱؎ المنار المنیف، فصل ۸ ۲؎ ایضاً فصل ۱۱ ۳؎ ایضاً ۴؎ قاضی شوکانی۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الاطعمۃ والاشربۃ ۵؎ ایضاً

طول اللہ ندامتہ یوم القیمۃ	بڑھائیں، اللہ تعالی قیامت کے دن
وسلط علیہ بکل شعرۃ علی	اس کی ندامت کو بڑھائے گا، اور
شاربہ سبعین شیطانا	مونچھوں کے ہر بال پر ستر شیطان مسلط
فان مات علی ذلک الحال	کردے گا، اگر اسی حالت میں مرگیا
لا یستجاب لہ دعوۃ ولا	تو نہ اس کی دعا قبول ہوگی اور نہ اس پر
ینزل علیہ رحمۃ[1]	رحمت نازل ہوگی۔
من قص اظفارہ مخالفا	جس شخص نے اپنے ناخن مخالف سمت
لم یری عینیہ رمدا[2]	سے کاٹے وہ آشوب چشم سے محفوظ رہے گا،

(باقی)

[1] الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ باب الخضاب والطیب، [2] المنار المنیف فصل ۴۹

ایک ضروری تصحیح

معارف ماہ جون ۱۹۴۳ء کے ص ۴۴۹ میں گولڈسیہر کی تحریر کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس میں کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے، جو حسب ذیل ہے:-

Muslim Studies by Ignaz Goldziher
(English Translation)
Vol II Part VI Talabal Hadith PP165-166

اسی طرح ڈاکٹر اسپرنگر کی عبارت کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس میں بھی کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے جو درج ذیل ہے:-

Ali sabah: Forward by A. sprenger

مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی

موجودہ ضلع اعظم گڈھ کے مغرب میں پندرہ بیس میل پر قصبہ ماہل مشہور بستی ہے، جو شاہان شرقیہ کے دور سے سواد جونپور میں علماء و مشائخ اور ارباب علم و فن کا مرکز رہی ہے، علمی تاریخ میں سب سے پہلے پرگنہ ماہل کا نام سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کے دور میں سنا گیا، جب کہ سلطان نے حضرت شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ کو یہاں جاگیر دی اور انھوں نے اس علاقہ میں دو گاؤں بہاء الدین پور اور کندھیارا (شاید کندھرا پور؟) آباد کئے، اس کے بعد شیخ صدر الدین قریشی ظفرآبادی چراغ ہند کی اولاد سے ایک بزرگ شیخ خیر الدین ظفرآبادی ترک وطن کرکے ماہل آئے، اور اپنے نام پر ایک گاؤں خیر الدین پور آباد کرکے مقیم ہوئے، ان کے صاحبزادے شیخ مبارک محمدی ماہلی متوفی ۹۸۳ھ کے نام پر اس دیار میں مبارکپور ایک گاؤں آباد ہوا، اسی دور میں شیخ نصیر الدین قلندر ظفرآبادی متوفی ۹۱۵ھ ماہل کے قریب نیگون میں اقامت پذیر ہوئے، جہاں ان کا مزار ہے، آخری دور میں شیخ گلشن علی ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولانا حسن علی متوفی ۱۲۵۰ھ گذرے ہیں، موخر الذکر دونوں حضرات فارسی شعراء میں ممتاز مقام کے مالک ہیں، غرض شرقی دور سلطنت سے یہ قصبہ علم و فضل اور علماء و فضلاء کا مسکن رہا، مغل دور میں بھی اس کا تعلق سرکار جونپور کے

محال اور پرگنہ جات تھا اور اودھ کی نوابی کے دور میں دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کے اہل علم و فن و ظائف اور جاگیروں کی ضبطی کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا ہوئے، کہنا چاہئے کہ اسی دور میں یہاں سے علم و علماء کا دور ختم ہو گیا۔

برطانوی دور میں پرگنہ ماہل انتظامی امور میں مختلف علاقوں سے متعلق رہا، لارڈ ولزلی اور نواب سعادت علی خان کے درمیان ایک صلح نامہ کی رو سے ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء (۲ رجب ۱۲۱۶ھ) میں چکلہ اعظم گڈھ، پرگنہ ماہل اور پرگنہ مئو کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کرکے برطانیہ کے نئے ضلع گورکھپور سے متعلق کر دیا گیا، پھر ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) کی ابتدا میں دیوگاؤں، نظام آباد، اور پرگنہ ماہل وغیرہ کو گورکھپور سے علیحدہ کرکے جونپور میں شامل کیا گیا، اور ۱۸ دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں اعظم گڈھ مستقل ضلع قرار دیا گیا مگر اب بھی دیوگاؤں اور ماہل جونپور کے کلکٹر کے ماتحت رہے، پھر کچھ دنوں کے بعد انکو بھی اعظم گڈھ میں شامل کر دیا گیا۔[1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باشندگان ماہل نے بڑی بہادری دکھائی اور تین ماہ سے اس دیار پر اپنا قبضہ رکھا، ۳ جون کو اعظم گڈھ میں ہندوستانی رجمنٹ نے بغاوت کی تو ادارت جہان نے فوج تیار کرکے نائب ناظم جونپور ہونے کا دعویٰ کرا دیا اور ماہل کی تحصیل پر قبضہ کرکے شمس آباد تحصیل پھولپور تک چودہ کوس کا علاقہ اپنے زیر تصرف کر لیا، انگریزی فوج کو اعظم گڈھ کی شورش سے فرصت ملی تو ۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کرنل راٹن بھاری فوج لیکر ادارت جہان سے مقابلہ کے لئے ماہل سے متصل مبارکپور نامی گاؤں میں پہونچا، جہاں ادارت جہان نے مضبوط پناہ گاہ بنا رکھی تھی، جانبین میں سخت مقابلہ ہوا مگر کرنل راٹن نے

---

[1] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۲۳۔

ادارت جہان کو گرفتار کرکے پھانسی دیدی، اور ماہل پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔[2]

یہ ہے ماہل کے قصبہ و پرگنہ کی مختصر گذشتہ تاریخ، اب ہم یہاں کے علماء، فضلاء، شعراء اور مشائخ کے جو حالات مل سکے ہیں لکھتے ہیں۔

شیخ فتح اللہ اودھیؒ

حضرت شیخ فتح اللہ اودھی دہلی کے علماء کبار اور مدرسین عظام میں تھے، ابتدا میں منارہ شمسی کے عقب میں واقع جامع مسجد میں درس دیتے تھے، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ شیخ صدر الدین حکیم کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہو گئے، مگر جب مجاہدہ و ریاضت کے باوجود سلوک و معرفت کے اسرار و رموز منکشف نہیں ہوئے تو اپنے مرشد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، انھوں نے حکم دیا کہ تم درس و تدریس اور کتابوں سے یکسوئی حاصل کر لو، انھوں نے اس پر عمل کیا، مگر کچھ کتابیں اب بھی ان کے مطالعہ میں رہیں جس کی وجہ سے مرشد کی نصیحت پر پورے طور سے عمل نہیں ہو سکا، آخر میں ان کتابوں سے علیحدگی کے بعد شیخ فتح اللہ پر احسان و تصوف کی راہ صاف ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر معرفت کے دروازے کھول دیئے، شیخ صدر الدین نے ان کو خلافت دیکر علاقۂ اودھ کی طرف روانہ کیا جہاں سلاطین شرقیہ کی قدردانی اہل علم و فضل کے لیے چشم براہ تھی، یہاں آنے کے بعد شیخ فتح اللہ بیعت و ارشاد کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول ہو گئے، اس وقت ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپور کی تعلیمی و تدریسی فضا پر چھائے ہوئے تھے، شیخ فتح اللہ نے اپنے نو عمر مرید و مسترشد شیخ محمد بن عیسیٰ تاج کو پہلے قاضی صاحب کے مدرسہ میں داخل کراکے علوم شرعیہ کی تعلیم دلائی پھر ان کو سلوک و معرفت کی تلقین کی،

صاحب مشکوٰۃ النبوت نے شیخ فتح اللہ کو عارف باللہ اور قدوۂ اہل اللہ کے لقب سے

---

[2] اعظم گڈھ گزیٹیر

یاد کیا ہے، اور ان کے بارے میں لکھا ہے، "او سرِ حلقۂ مشائخ اودھ بود، و کرامات و خوارق عادات وے مشہور است" بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے تعارفی القاب میں "صوفی" لکھا ہے، ان کا حلقۂ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا، ان کے مریدین و خلفاء میں بڑے بڑے اہل فضل و کمال تھے، جن میں شیخ محمد بن عیسٰی جونپوری، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی مصنف آداب السالکین اور شیخ سعد الدین اودھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ فتح اللہ اودھی ۲۷ ربیع الثانی ۸۲۱ھ میں فوت ہوئے۔[1] ان کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک عالم مولوی علی حسن ماہلی متوفی ۱۲۵۰ھ نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ راقم کے اجداد میں سے ایک بزرگ شاہ فتح اللہ انصاری بن عبداللہ انصاری سلطان تغلق کے دور میں دہلی آئے، کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد سیر و سیاحت کرتے ہوئے جونپور پہنچے جو ان دنوں سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت تھا، یہاں انکے ارشاد و تلقین کا شہرہ عام ہوا، اور حاکم وقت ان کی زیارت کا مشتاق ہوا، ایک دن جامع مسجد میں ان سے ملا، اور مہینہ میں دوبار ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتا رہا، کچھ دنوں کے بعد سلطان نے شاہ فتح اللہ کی اولاد کے گذر بسر کے لیے چند مواضع پرگنہ ماہل میں جو جونپور کے پرگنات و مضافات میں ہے بطور جاگیر عطا کیے، انھوں نے پرگنہ مذکور میں اپنے بڑے صاحبزادے شاہ بہاء الدین کے نام سے بہاء الدین پور، اور کندھیارا (کندھرا پور ؟) دو گاؤں آباد کیے، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی، ان کا مزار بھی اسی قریہ میں ہے۔[2]

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۳ و صفحہ ۱۶۴، مشکوٰۃ النبوت قلمی صفحہ ۱۵۸ تا صفحہ ۱۶۰، تذکرہ علماء صفحہ ۱۵۹، نزہۃ الخواطر بحوالہ گنج ارشدی جلد ۳ صفحہ ۱۱۲،

[2] تذکرہ صبح وطن، صفحہ ۵۰،

ہمارے نزدیک شیخ فتح اللہ اودھی اور شاہ فتح اللہ انصاری ایک ہی شخصیت ہیں، ان کے سب سے پہلے تذکرہ نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اور بعد کے سب تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کو صرف اودھی کی نسبت سے یاد کیا ہے، کسی نے انصاری نہیں لکھا ہے، شاہ صاحب نے نہ ان کی ولدیت لکھی ہے، نہ سنہ وفات اور نہ ہی مدفن کا ذکر کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالہ سے ان کی تاریخ وفات ۲۷ ربیع الثانی ۸۲۱ھ بتائی ہے، مگر مشکوٰۃ النبوت میں ہے کہ "سنہ وفاتش در نظر نیامدہ، ولیکن معاصر سلطان ابراہیم شرقی بود"۔ سلطان ابراہیم کا دورِ حکومت ۸۰۴ھ سے ۸۴۴ھ تک ہے، نزہۃ الخواطر میں ان کے والد کا نام نظام الدین درج ہے، اور مولوی حسن علی ماہلی نے شاہ عبداللہ انصاری لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ نظام الدین لقب اور عبداللہ نام ہو، بعد کے کئی مورخین نے ان کا مزار اودھ میں بتایا ہے، مگر مولوی حسن علی نے لکھا ہے "بالجملہ در پرگنہ مذکور از نام شاہ بہاء الدین پسر بزرگ خود قریہ بہاء الدین پور و کندھیارا آبادان ساختہ دران سکونت اختیار کردند، مزار متبرکہ شاہ فتح اللہ موصوف درہماں قریہ واقع است"۔ ان دونوں اقوال میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ یہ علاقہ اس زمانہ میں اودھ میں شمار ہوتا تھا، اس کے علاوہ کسی اور فتح اللہ نامی بزرگ کا تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ علامہ فتح اللہ ملتانی اس دور کے مشہور عالم تھے، جن کا مولد و منشا اور مدفن ملتان ہے، شیخ فتح اللہ اودھی کا یہ شعر بہت مشہور ہے،

یک دوست پسند کن چوں یک دل داری
گر ندہب مردمانِ عاقل داری

شیخ نصیر الدین قلندر ظفر آبادیؒ

شیخ نصیر الدین بن محمد بن رفیع الدین عباسی

---

[1] اعظم گڈھ گزیٹر،

سمرقندی ظفرآبادی سلسلۂ قلندریہ کے مشائخِ کبار میں ہیں، ان کے حالات انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، کشف النقاب عن الاحوال والانساب، اصول المقصود، فصول مسعودیہ، بحرِ زخار، تجلی نور، اور نزہۃ الخواطر وغیرہ میں ہیں، شیخ قطب الدین بنیاد دل قلندر جونپوری کے اجل خلفا میں ان کا شمار ہوتا ہے، ظفرآباد سے ترک وطن کرکے پرگنہ ماہل کے مقام نیگوں میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، اور یہیں فوت ہوئے، اس علاقہ میں ان کو حکومت وقت سے کئی مواضع بطور جاگیر عطا ہوئے تھے، قلندری روایت کے مطابق شیخ عبدالعزیز مکی علمبردار کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مبارک شیخ نصیرالدین کو ملا تھا، جو بطور تبرک محفوظ تھا، واللہ عالم، شیخ نصیرالدین کی بیوی ان کے مرشد شیخ قطب الدین بنیاد دل کی صاحبزادی تھیں، ان کے صاحبزادے شاہ نور قلندر بن شاہ نصیر قلندر کو شیخ قطب الدین بنیاد دل اور اپنے والد دونوں بزرگوں سے خلافت حاصل تھی، انتصاح میں ہے کہ شاہ نصیر نے اپنے صاحبزادے شاہ نور کے علوئے مرتبت کو دیکھکر ان سے کہا کہ دو آفتاب ایک جگہ نہیں رہ سکتے ہیں، اس لیے شاہ نور نے نیگوں چھوڑ کر شہر پور (فیض آباد) میں سکونت اختیار کرلی تھی، اور وہیں فوت ہوئے، ان کا مزار بھی وہیں ہے، شیخ نصیرالدین کا وصال ۲۵ جمادی الاولیٰ ۹۱۵ھ میں نیگوں میں ہوا اور وہیں دفن کئے گئے، مزار پر شاندار روضہ ہے، ان کی تاریخ وفات میں یہ اشعار کسی نے کہے ہیں،

آنکہ شاہِ نصیرِ دین بودہ — صاحبِ صدق و ہم یقین بودہ
او ز بنیائے دل خلافت یافت — علم پیر را بصدق افراشت
بعد چندے بقصبۂ نیگوں — کرد از حکم پیرِ خویش سکوں
بست و پنج از جمادی اولیٰ بود — کہ ز دنیائے دوں سفر فرمود

سال تاریخ او یجا باشد — گفتہ ام۔ شاہد خدا باشد[1]

شیخ مبارک محمدی ماہلی

شیخ مبارک بن شیخ خیرالدین ماہلی جونپوری، شیخ صدرالدین قریشی ظفرآبادی چراغ ہند کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ خیرالدین ظفرآباد سے ترک وطن کرکے پرگنہ ماہل میں چلے آئے، اور اس کے قریب اپنے نام پر خیرالدین پور گاؤں آباد کرکے بود و باش کرنے لگے، شیخ مبارک نے بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور جونپور کے اساتذہ و شیوخ سے تحصیل و تکمیل کی، طریقت و روحانیت کی تلقین و تربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقان سرائمیری متوفی سنہ ۹۵۰ھ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگان علم و عرفاں اس چشمۂ صافی سے سیراب ہو رہے تھے، میر صاحب شیخ مبارک کے ہموطن تھے، ماہل اور سرائے میر کے درمیان معمولی سا فاصلہ ہے، شیخ مبارک نے بھی میر علی عاشقان کے آستانہ پر حاضری دی اور ان کی خدمت و صحبت میں رہکر خلافت و مشیخت کا مرتبہ پایا، مرشد نے مسترشد کو خلافت کے ساتھ محمدی کے لقب سے بھی نوازا، اس کے بعد شیخ مبارک نے میر صاحب کے حکم سے جونپور کے محلہ سپاہ میں خانقاہ تعمیر کی اور علائق دنیا سے یکسو ہوکر زہد و تقویٰ اور عبادت و قناعت میں پوری زندگی گذاری، آپ کی ذات سے ایک مخلوق نے فیض اٹھایا، تجلی نور میں ہے کہ شیخ مبارک نے خاندانی فیوض و برکات کے علاوہ میر سید علی قوام سے تمام سلاسلِ مروجہ کے فیوض حاصل کئے اور اس قدر نفس کشی اور ریاضت کی کہ ان کے مشاہیر خلفا میں شمار کئے گئے، انھوں نے ارشاد و تلقین اور باطنی اشغال کے ساتھ تعلیم و تدریس اور ظاہری علوم کا مشغلہ بھی رکھا اور ان کی خانقاہ علمی درسگاہ اور روحانی تربیت گاہ دونوں تھی ۱۴ شوال ۹۸۳ھ میں جونپور میں

---

[1] انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۱۹ و نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۸۸ و نیز بعض حالات جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری نے ادجین سے روانہ کئے ہیں،

فوت ہوئے "فخر زمانہ" تاریخ وفات ہے۔[1]

شیخ گلشن علی ماہلی | شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کا تذکرہ محمد قدرت گوپاموی کی کتاب تذکرہ نتائج الافکار (تصنیف ۱۲۴۳ھ) میں مل سکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ فتح اللہ اودھی (شاہ فتح اللہ انصاری) کی اولاد سے ہیں، بارہویں صدی کے مشہور فارسی شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے، محمد قدرت گوپاموی کا بیان ہے کہ شیخ گلشن علی پسر شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کی ولادت ۱۱۰۷ھ میں ہوئی، انھوں نے فارسی کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور نحو و صرف کی تعلیم اپنے دیار کے بعض اساتذہ سے حاصل کی، خوش نویسی کی مشق بھی کی، اور خط نستعلیق و شکستہ و ثلث بہت اچھا لکھتے تھے، بعد میں دہلی گئے، اور میر افضل ثابت کی خدمت میں رہکر مشق شعر و سخن کی، ان کے انتقال کے بعد شمس الدین فقیر کو اپنے اشعار دکھانے لگے، علی حزین سے بھی شاعری میں اکتساب فیض کیا، ایک مدت تک دہلی میں نواب شیر افگن خان باسطی اور چند سال نواب علی قلی خان والہ کی خدمت میں رہے، آخر میں ماہل میں آکر گوشہ نشیں ہوگئے اور یہیں ۱۱۹۳ھ کے اواخر میں انتقال کیا، شیخ گلشن علی کے چند اشعار یہ ہیں،

رفتگان از بزم و طرب لذت و تمنا باقی است | بادہ شد صرف و ہوا در دل مینا باقی است
لالہ در دشت نشانی ست ز مجنون کہ ہنوز | داغہائے غم او بر دل صحرا باقی است

دلم از اختلاط یار با اغیار می نالد | کہ چون بلبل بہ بیند پہلوئے گل خار می نالد
دو چشم فتنہ ساز تو باشد بلا نگاہ | باز آفت نگاہ تو دارد خدا نگاہ

رباعیات

گر غنچۂ گل تنگ دہانی دارد (۱) چون لعل تو کے گہر افشانی دارد

۱؎ تجلی نور ج ۱ ص ۱۰۱، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۸

ہر چند کہ سرو مصرع موزوں کرد | چون قامت تو کجا روانی دارد

شام آن بت مہ طلعت خورشید غلام | آمد بنظارۂ مہ نو بر بام
از ابلہ فلک نظرم بر رویش (۲) | آں شوخ ہلال دید من ماہ تمام[1]

مولوی محمد حسن علی ماہلی | آخری دور کے ماہلی علماء و فضلاء میں مولانا محمد حسن علی صاحب حسن انصاری ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ کو خاصی شہرت و ناموری حاصل ہوئی ان کو اپنے دور کے فارسی شعراء میں ممتاز مقام حاصل تھا، متعدد تذکرہ نگاروں نے ان کا حال لکھا اور انتخاب کلام درج کیا ہے، سب سے پہلے محمد قدرت گوپاموی نے نتائج الافکار (سنہ تصنیف ۱۲۴۱ھ) میں ان کا حال لکھا، اس کے بعد نواب والاجاہ محمد غوث خان اعظم نے تذکرہ صبح وطن (بلاغت ۱۲۵۹ھ) میں ان کے خود نوشت حالات درج کیے اور گلزار اعظم میں ان کا تذکرہ کیا، یہ تینوں کتابیں مولوی صاحب کی زندگی میں لکھی گئیں، اس کے بعد نواب علی حسن خان بن نواب صدیق حسن خان نے صبح گلشن میں (طباعت ۱۲۹۵ھ) ان کا حال لکھا ہے، حدیقۃ المرام نام کی کسی کتاب میں بھی ان کا حال درج ہے جس سے صاحب نزہۃ الخواطر نے استفادہ کیا ہے "صبح وطن" کا تذکرہ سب سے زیادہ مفصل اور بعد والوں کا ماخذ ہے، پھر بھی دوسرے تذکروں میں بعض نئی معلومات ہیں،

مولوی محمد حسن علی بن شیخ نوازش علی حنفی انصاری ماہلی کا تخلص حسن ہے، ۱۱۹۶ء میں ماہل میں پیدا ہوئے، بنارس میں تعلیم حاصل کی فراغت کے بعد کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، کچھ دنوں کے بعد مدراس ملک کمپنی کے مدرسہ میں چلے گئے اور مدرسہ ٹوٹ جانے کے بعد مدراس کی عدالت کے صدر مفتی ہوئے، اس عہدہ پر تھے، کہ ۲۹ رجب ۱۲۵۸ھ میں مدراس ہی میں فوت ہوئے،

۱؎ نتائج الافکار ع ۹۲۰۰۸

صبح وطن میں انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ قریہ بہاءالدین پور میں ان کے جد امجد شاہ فتح اللہ انصاری کی اولاد و احفاد بزرگانِ علم و فضل کے انداز پر موجود تھی ان میں سے اکثر متوکل اور گوشہ نشین اور بعض شاہان دہلی کے مناصب جلیلہ و خدمات عمدہ پر مامور تھے۔ میرے جد امجد نے کبھی دائرۂ توکل سے باہر قدم نہیں رکھا، اور فقر و فاقہ میں اپنی عمر بسر کی، البتہ مجھکو سیر و سیاحت اور شہروں کے عجائب و غرائب کے مشاہدہ کا شوق دامن گیر ہوا۔

"در ایام طفولیت از وطن مالوف برآمد، در بنارس تحصیل کتب درسیہ فارسیہ بخدمت ملا محمد عمر کہ بلاواسطہ نسبت تلمذ بہ سراج الدین علی خان آرزو و شیخ علی حزیں داشتند در سن پانزدہ سالگی کردم و بعد ازاں ایام و لیالی تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ جا بجا کردہ در سن بست و پنج سالگی فراغ حاصل نمودم۔ نسبت تلمذ در علوم متداولہ معقول و منقول بیک واسطہ بمولوی برکت الہ آبادی قدس سرہ کہ از علمائے فحول بودند میرسد

اتفاقاً بعد از تحصیل علوم قائد تقدیر بہ مملکت بنگالہ رسانید، در انجا شطرے از اوقات را بدرس و تدریس علوم مروجہ گذرانیدم، و ارادۂ مراجعت بوطن مالوف داشتم، اتفاق نشد و حسب طلب حکام وقت در ۱۲۳۲ھ یکہزار و دو صد و سی و دو سال وارد مدراس حرسہ اللہ عن الادناس گردیدہ سنگ بموزہ ام افتاد و از عرصہ بست سال و کسرے در اینجا رحل اقامت افگندم، مجملے از حال من آوارہ دور از دیار اینست[۱]

اس مجمل سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی میں وطن سے نکل کر بنارس پہونچے اور پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۱۹۶ھ میں پیدائش کے حساب سے ۱۲۱۰ھ میں فارسی کی تعلیم سے فارغ ہوئے اسکے بعد مختلف مقامات پر علوم مروجہ کی تحصیل کرکے پچیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۲۰ھ میں عالم و فاضل ہو گئے،

[۱] صبح وطن ص ۵۵

اسکے بعد ہی کلکتہ میں مدرس ہوئے، جہاں کم و بیش بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۲۳۲ھ میں کلکتہ ہی سے مدراس جاکر وہاں کے سرکاری مدرسہ میں بیس سال سے زائد مدت تک تعلیم دی، یہ واقعات ۱۲۵۲ھ تک کے ہیں، اس کے بعد صدر مفتی ہوئے اور چار سال اس عہدہ پر رہکر ۱۲۵۸ھ میں راہی ملکِ عدم ہوئے،

اس بیان میں تحصیل علم کے سلسلہ میں صرف ایک مقام بنارس اور ایک استاد ملا محمد عمر بنارسی کا نام ہے اسکے بعد جا بجا علوم متداولہ کی تحصیل کی اور بیک واسطہ مولوی برکت الہ آبادی سے شرف تلمذ کی تصریح کی ہے، ظاہر ہے کہ جا بجا مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا ہوگا، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ کسی کا نام نہیں لیا، اسکی کوئی خاص وجہ ان کے نزدیک رہی ہوگی۔

مولوی ملا محمد عمر بن غوث عمری بنارسی ۱۱۳۳ھ میں مرزاپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر دہلی جاکر وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا، اسکے بعد سراج الدین خان آرزو اکبرآبادی (ولادت ۱۱۰۱ھ وفات ۱۱۶۹ھ) اور فارسی کے مشہور شاعر علی حزیں بنارسی سے شاعری میں استفادہ کیا، ملا محمد عمر صاحب دیوان شاعر تھے، انھوں نے گنج شائگان کے نام سے فارسی شعراء کے حالات میں ایک کتاب بھی تصنیف کی، ۹۷ سال کی عمر میں ۱۲۳۰ھ میں بنارس میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے فراغت کے بعد مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا تھا،

مولانا محمد برکت بن عبدالرحمٰن کا خاندان ٹھٹھی سے الہ آباد جاکر آباد ہوگیا تھا، انھوں نے شیخ ملا کمال الدین فتحپوری وغیرہ سے تعلیم پائی اور علوم ریاضیہ میں خاص طور سے مشہور ہوئے، پوری عمر درس و تدریس میں بسر کی، ریاضی کی مشہور و متداول کتابوں پر ان کے حواشی ہیں،

مولوی حسن علی صاحب نہایت ذہین و طباع اور ذی علم تھے ان کے حالات عام طور سے فارسی شعرا کے تذکروں میں درج ہیں اسلئے ان کی شاعری کا پہلو زیادہ اجاگر ہوا، اور انکی دوسری علمی حیثیات ابھر نہ سکیں

محمد قدرت گوپاموی نے ان کو "جامع علوم عقلی نقلی" کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے۔

"وبہ حسن اعتقاد در جمیع این فنون مہارت شائستہ و امارت بایستہ حاصل ساخت" (نتائج الافکار ص ۲۰۰)

علوم مروجہ متداولہ میں مہارت کے ساتھ ریاضی اور شاعری سے خاص تعلق تھا اور ان میں ذواستاد وقت مانے جاتے تھے، ریاضی میں انکی متعدد کتابیں اور رسائل ہیں، نواب والاجاہ نے لکھا ہے "احسن تخلص مولوی محمد حسن علی است کہ در علم فارسی و عربی و ریاضی استاد وقت خود است، رسالہ تبصرۃ الحکمۃ در طبیعیات و الٰہیات بنام این راقم السطور مرقوم ساختہ، و رسالہ منتخب التحریر در علم ریاضی و رسائل تکسیر و جفر و رمل وغیرہ از مولفات دست صحیح وطن" (۵۶)

غالب گمان ہے کہ تبصرۃ الحکمۃ کے ساتھ منتخب التحریر اور تکسیر و جفر اور رمل وغیرہ کے رسائل بھی مدراس میں طبع ہوئے ہوں گے، نواب والاجاہ سے مولوی صاحب کے خوشگوار تعلقات تھے اور اندرلو قدردانی نواب صاحب نے انکی کتابوں کی طباعت کا انتظام کیا ہو گا،

مدراس میں مولوی صاحب کو علمی ماحول ملا اور ان کی پوری قدردانی ہوئی، اور وہ شعر و شاعری اور فارسی زبان کے ساتھ علوم ریاضیہ کے استاد یگانہ و منتخب زمانہ" قرار پائے نواب والاجاہ نے گلزار اعظم میں لکھا ہے،

"بتدریس کتب فارسیہ خصوصاً کلام متقدمین و علم ریاضی استاد یگانہ و منتخب زمانہ (ص ۱۹۰)

اسی کے ساتھ بڑے شریف و نجیب اور با اخلاق عالم تھے، عزت نفس و شرافت طبع حلم و انکسار کے پیکر تھے، نواب والاجاہ۔ جامع انداز میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں،

"شرافت از جبینش پیدا بود کے، نجابت از گل خلقش ہویدا، حلمش با انکسار توام و اخلاقش با اکرام ہمدم" (گلزار اعظم ص ۱۹۰)

دینی علوم میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، کتاب و سنت اور فقہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، مدراس میں صدر مفتی ہونا اس کی دلیل ہے، معلوم ہوا یہ وصف بعد میں

نمایاں ہوا، جب کہ شعر و سخن، ریاضی دان اور مدرسی کی شہرت عام ہو چکی تھی، اس لئے ان کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی گوشوں کو زیادہ اجاگر کیا۔

اصل میں وہ ایک کامیاب مدرس اور استاد وقت تھے، شعر و شاعری ان کا خاص مشغلہ نہیں تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسی میں ان کو زیادہ شہرت و ناموری حاصل ہوئی، شعر کبھی کبھی کہتے تھے، مگر طبیعت موزون پائی تھی، اس لئے جو کچھ کہتے تھے اچھا کہتے تھے انکے تلامذہ میں اچھی خاصی تعداد ان شعرا کی ہے جو تیرھوین صدی میں جنوبی ہند کے آسمان شعر پر نمایاں تھے،

ایام طفولیت میں وطن سے نکلنے کے بعد ان کو واپسی کا موقع نہیں ملا، ممکن ہو فراغت کے بعد ایک آدھ بار وطن آنے کا اتفاق ہوا ہو، ورنہ بقول ان کے تحصیل علوم کے بعد قائد تقدیر نے ان کو کلکتہ پہونچا دیا، وہاں سے وطن کی مراجعت کا ارادہ کیا مگر اس کا موقع نہ مل سکا، اور ادھر ہی سے مدراس چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، غالباً انھوں نے مدراس میں متاہل زندگی بسر کی ہو گی، اور انکے بال بچے رہے ہوں گے مگر ان کا حال معلوم نہیں،

باوجود یکہ مدراس میں ان کو بہترین ماحول ملا، قدردانی بھی ہوئی، اونچا عہدہ پایا مگر اپنے وطن والوں سے مجبوری اور اپنی مجبوری کی وجہ سے ہمیشہ دل گرفتہ رہے اور اپنے کو "آوارہ دور از دیار" ہی سمجھتے رہے،

"قائد تقدیر" کی قیادت میں اس "آوارۂ دور از دیار" کا دور نہایت پر آشوب تھا، علما و فضلا سخت ابتلا و آزمائش میں مبتلا تھے، نوابان اودھ کی اہل علم و فضل کے ساتھ زیادتی اور نظام سلطنت کی ابتری عام تھی، اس دور پر فتن کا پورا نقشہ علامہ آزاد بلگرامی نے کھینچا ہے

سنہ ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین کی مٹی میں علم و علماء کی سرگرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خان نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا، اس نے یہاں کے اکثر بڑے بڑے شہروں جیسے جونپور، بنارس، غازیپور، کڑامانک پور، کوڑا جہان آباد وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم وجہ خاندانوں کے وظائف اور جاگیروں کو یکسر ضبط کر لیا، جس کی وجہ سے شرفاء و نجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی، لوگوں کو معاش و معیشت کی الجھنوں نے کسب علم سے باز رکھکر پیشۂ سپہ گری میں ڈال دیا، اور درس و تدریس کا رواج یوں ختم ہو گیا کہ جو مدارس قدیم زمانہ سے معدنِ علم و فضل تھے بالکل ویران ہو گئے، اور اکثر ارباب کمال کی بھری انجمنیں اجڑ گئیں، برہان الملک کے بعد اس کے بھانجے ابو المنصور صفدر جنگ کو حکومت ملی وظائف اور جاگیریں بدستور ضبط رہیں، اور جب محمد شاہ کے آخری عہد میں ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی اس کے حوالہ کر دی گئی تو اس صوبہ کی جاگیریں اور وظیفے بھی باقی نہ رہ سکے۔ احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ وزیر بنا تو صوبہ اودھ وغیرہ کے نائب نے وظیفہ یاب طبقہ پر سختی کی، جس کے باعث یہ دیار پامال ہو گیا۔[1]

پھر آخری دور میں انگریزی اقتدار کے عروج اور پورے ملک میں عام بے چینی کی وجہ سے ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی، اس لئے ارباب علم و فن نوابوں، امیروں اور راجوں کے دروازوں کا رخ کرنے لگے بہتوں نے برطانوی مدرسوں سے تعلق پیدا کر لیا، چنانچہ مولوی حسن علی ماہلی اور ان کے دیار کے کئی علماء نے کلکتہ مدراس اور ارکاٹ وغیرہ کا رخ کیا،

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲،

ان کا انتقال مدراس کی عدالت کی صدارتِ افتاء کے دور میں ۱۲۵۸ھ میں ہوا، گلزار اعظم میں ہے،

"بعد چند سال لوائے خدمت افتائے صدر مفتی عدالت افراخت، و در ہماں کارگزاری در سال ۱۲۵۸ھ کوس رحلت ازیں دار سراسر وحشت نواخت" (ص ۱۹۰)

سب تذکرہ نگار ان کی وفات ۱۲۵۸ھ میں لکھتے ہیں،

نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ المرام کے حوالہ سے ۲۹ رجب ۱۲۵۹ھ درج ہے،

مولوی صاحب تمام علوم متداولہ اور عقلیہ و نقلیہ میں استاد یگانہ اور منتخب زمانہ ہونے کے ساتھ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، جو ان کے فطری ذوق کا نتیجہ تھا، اس ذوق نے بنارس میں ملا محمد عمر کی صحبت میں اور جلا پائی، مگر وہ کبھی کبھی شاعری کرتے تھے، محمد قدرت گوپاموی نے لکھا ہے،

چونکہ در فنون نظم ہم طبع بلند دارد، و تلاشِ ارجمند گاہ گاہ بفکر سخن ملتفت می شود (نتائج الافکار ص ۲۰۰)

نواب والاجاہ نے بھی یہی لکھا ہے، باقتضائے موزونیت طبع گاہ گاہ بفکر سخن ہم مشغول بودہ مشاطۂ طبع رسایش باین زیبائش حسن شاہد کلام می افزاید (گلزار اعظم ص ۱۹۰)

نمونہ کلام یہ ہے،

دکانِ دلبراں بے رونق از روئے نگارم شد — بے قدرے بہ پیشِ مہر کے رہا شاچراغان را
نزاکت آں قدر دارد کفِ پائے نگار نیش — کہ برگِ گل بجائے خار باشد پائے جاناں را

پُر از مشکِ ختن می بینم امشب کوہ و صحرا را — مگر بادِ صبا وا کرد آں زلفِ چلیپا را

از روئے خود فگن صنما این نقاب را — پوشیدہ کس ندید رخِ آفتاب را

ہائے اے حسنؔ! وصالِ ازاں مہر رخ مجو در برگرفتہ است کسے آفتاب را!

ازبسکہ وحشی است دلِ بے قرار ما رم می کند ز سایۂ مردم غبار ما
دربر نہالِ قامت او نشاندہ ایم گل کرد صد بہار ز باغِ کنار ما
تا جلوۂ رخ تو ملکِ دلم تبافت آئینہ زار گشت ز حیرت دیار ما
روزے بہر قدم گذارے سنگدل کہ آہ از حد گذشت مرتبۂ انتظارِ ما
بر روئے زرد ما است رواں اشک لالہ گوں یکجا بہم شدہ است خزان و بہار ما

دوش رفتم بسر کوئے صنم استادم دید و گفتا کہ کدامی، و چہ کار است اینجا
اے حسنؔ! با سیرِ گلستان چہ ضرور است ترا گوشۂ دامنت از گریہ بہار است اینجا

نادیدہ است گل بچمن روئے یارِ من از پنجہ ہائے خار گریبان دریدہ است
سبزہ بروئے دلبرِ من نیست اے حسنؔ طوطی بآبِ چشمۂ حیوان رسیدہ است

دوش چون بے رحمی ظالم، دلِ من یاد کرد من جدا فریاد کردم، دل جدا فریاد کرد
از سرشکِ لالہ گون گشتم چوگل رنگیں لباس نورِ چشمِ من لباسِ دیگرم امداد کرد
قطرۂ اشکم بخاک افتاد و دوشش رو نداد دیدہ این دُرِّ یتیمم رائگاں بر باد کرد
اے حسنؔ! پیکِ دیارِ آن صنم اینک رسید مرحبا کہ خانۂ ویرانہ ام آباد کرد

اے باد پیشِ یار بر و با ادب بگو کیں دل برائے دیدنِ تو زار می طپد
چشمِ تو دوست دارم اگر می طپم بجا است تیمار دار از غمِ بیمار می طپد

دوشینہ در برِ آن بتِ عیار داشتم خوش طالعے کہ دولتِ بیدار داشتم
کالم پُر از حلاوتِ دنیا است اے حسنؔ! شاید بخواب لب بلبِ یار داشتم

اے حسنؔ! داغِ دلِ من رونقِ من بس بُود احتیاجِ شمع دیگر نیست در کاشانہ ام

بر خاک نشستیم با میدِ نگاہے شاید کہ بتِ ما گذرد بر سرِ راہے
ہرچند ضعیفیم ولے حامیِ عشقیم مر تیزیِ آتش بود از برگِ گیاہے

ہم نے یہ اشعار صبحِ وطن سے نقل کئے ہیں، دوسری کتابوں میں ان ہی کا مختصر انتخاب درج ہے ــــ

مولوی حسن علی صاحب کی پوری زندگی وطن سے دور کلکتہ اور مدراس میں گذری، ان ہی دونوں جگہوں میں ان کے کمالاتِ علم و ادب کے میدان میں ظاہر ہوئے مدراس میں ان کو زیادہ مدت تک قیام کرنے اور کام کرنے کا موقع ملا اس لئے یہیں ان کی علمیت و قابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے، چنانچہ شاعری میں ان کے کئی تلامذہ کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں، جن کا تعلق جنوبی ہند سے ہے: ان میں سے چند نام یہ ہیں،

والہؔ تخلص اور مولوی سید حمید الدین بن سید ابو طیب خان نام ۱۲۱۲ھ میں رحمت آباد میں پیدا ہوئے، مدراس کے مشہور علماء مثلاً مولوی محمد سعید اسلمی مدراسی، مولوی علاء الدین لکھنوی، مولوی تراب علی خیر آبادی، اور مولوی حسن علی ماہلی سے علوم عربی کی تحصیل کی تھی، (صبح وطن ص ۲۱۱)

بہجتؔ تخلص مولوی محمد تاج الدین حسین بن غیاث الدین خان خوشنویس نام ۱۲۱۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر کے بعد سے بارہ سال تک مدرسہ کمپنی میں مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی تراب علی نامی سے علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی (گلزار اعظم ص ۱۳۰)

بلیغؔ تخلص، شاہ محمد روح اللہ بن شاہ محمد نور اللہ نقشبندی خوشنویس ۱۲۳۳ھ میں

پیدا ہوئے، کتب فارسی، فن عروض و قوافی و بیان و بدیع و نجوم و رمل و تکسیر وغیرہ مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی حاجی محمد محی الدین میران سے حاصل کئے، اور ان ہی دو ان سے شعر و سخن کی مشق کی۔ (،، گلزار اعظم ص ۱۳۳)

حیران ۔ تخلص، مولوی حاجی محی الدین بن فقیر محمد، ساکن کرنول، نواب عمدۃ الامراء بہادر کے مطبخ کے داروغہ تھے، ۱۲۱۰ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، سن شعور کے بعد اکتساب علم کا شوق پیدا ہوا، مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی صاحب حسینی سے فارسی و عربی علوم پڑھکر فراغت کے قریب پہونچے (،، ص ۱۶۱)

صاحب ۔ تخلص، مولوی غلام علی المخاطب بہ منشی الملک دبیر الدولہ اعتماد خان بہادر، عطارد جنگ بن محمد نائطی المخاطب بہ دبیر الملک مشیر الدولہ رازدار خان بہادر محمود جنگ، ۱۲۱۷ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی ارتضی خان بہادر کی خدمت میں رہکر کتب عربیہ کی تعلیم حاصل کی (،، ص ۲۴۶)

قادر ۔ تخلص، مولوی قادر علی بن حاجی تراب علی نامی، ۱۲۳۲ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، کتب عربیہ ہدایہ تک مولوی حسن علی ماہلی، مولوی سید عبدالودود عاشق، مولوی، سید عبدالقادر حسینی اور مولوی یوسف علی خان سے پڑھیں (،، ص ۲۹۵)

فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے

از جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

(۲)

(۱۱) **خزینۂ گنج** ــــــ اس تذکرہ کے وجود کا علم دو فہرستوں سے ہوتا ہے ایک اسپرنگر کی تیار کردہ فہرست اور دوسری برلن لائبریری فہرست۔ اندیا آفس کا مخطوطہ اگرچہ اب نایاب ہے۔ لیکن برلن مخطوطہ کا وجود باقی ہے۔ اس طرح اس تذکرہ کو نایاب نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن اس مضمون میں اس تذکرہ کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ مذکورہ بالا فہرستوں سے جو اطلاعات ملتی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ دونوں مخطوطات نامکمل ہیں، اور ان میں شروع اور آخر کا حصہ موجود نہیں ہے۔ چونکہ اس تذکرہ کے دوسرے نسخے کہیں موجود نہیں ہیں اس لئے موجودہ نسخوں کے غیر موجود حصے یقیناً نایاب ہیں۔

خزینۂ گنج کے جن نامکمل مخطوطات سے متعلق اسپرنگر اور برلن فہرستوں میں جو اطلاع فراہم کی گئی ہے، اس کے مطابق اس میں نویں اور دسویں صدی ہجری کے چار سو، اور آٹھویں صدی ہجری کے بعض شعراء کا ذکر حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے، شعراء کے حالات کے ساتھ ان کی تصنیفات و تالیفات کا بھی ذکر ہے، اس کی ابتدا ابن یمینی فریومدی سے ہوئی ہے، اور خاتمہ ہمایوں بادشاہ پر ہوا ہے۔ ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے۔

؎ اسپرنگر نمبر ۱۱؛ برلن ۶۴۴، خودنوشت نسخہ؛

صاحب ملفوظات موعظت آئین امیر محمود مشہور بہ ابن یمین [1] ..."

اس تذکرہ کے شعراء کی فہرست اسپرنگر نے اپنی فہرست میں درج کی ہے [2]۔ اس کی تالیف میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے [3]۔

(۱) تذکرۂ دولت شاہ (۲) مجالس النفائس۔ (۳) تذکرۂ احباب نثاری (۴) مقالۃ الابرار (۵) مجالس عبدالقادر (۶) جواہر العجائب۔ (۷) عرفات العاشقین۔

ماخذ کی اس فہرست پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف میں تذکرۂ احباب کے علاوہ زیادہ استفادہ عرفات سے کیا گیا ہے کیونکہ فہرست بالا میں تذکرۂ احباب کے سوا دوسری تمام کتابیں عرفات کا ماخذ ہیں، اس لئے ان سب کے بجائے تنہا عرفات سے استفادہ کرنا کافی ہوا ہوگا، دوسری وجہ یہ ہے کہ مقالۃ الابرار خالص تاریخی نوعیت کی کتاب ہے جس سے تقی اوحدی کے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نگار کو بلاواسطہ استفادہ کا موقع نہیں ملا، ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ مولف کے پیش نظر عرفات اور تذکرۂ احباب ہی رہے ہوں گے البتہ انھوں نے عرفات کے ماخذوں کی مناسبت سے ان تمام کتابوں کو اپنا ماخذ قرار دیا جو خود عرفات کے ماخذ تھے۔

خزینۂ گنج کا مولف میر عمادالدین محمود بن میر حجۃ اللہ اور اس کا تخلص الٰہی ہے۔ تخلص ہی سے اس کی شہرت ہے۔ اس کا تعلق سعد آباد (ہمدان کے مضافات میں ایک مقام) کے حسینی سادات سے تھا۔ ۱۰۱۰ھ میں الٰہی شیراز گیا، اور تقریباً ساڑھے تین سال تک وہاں تحصیل علوم میں مشغول رہا، پھر وہاں سے وہ عراق گیا، اور ایک یا دو سال تک صفاہان میں

[1] اسپرنگر نمبر ۱۱؛ برلن نمبر ۶۶۲۔ [2] ایضاً ص [3] ایضاً

اقامت کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا، اور ۱۰۲۰ھ میں قندھار پہونچا جہاں مرشد بروجردی کی وساطت سے میرزا غازی ترخان کی ملازمت سے منسلک ہو گیا، اسی زمانہ میں الٰہی کابل بھی گیا، اور ظفر خان احسن کی بارگاہ میں اس کی رسائی ہوئی، یہیں حکیم حاذق گیلانی سے اس کی ملاقات ہوئی جو حاکم بخارا امام قلی خاں کے دربار سے ہندوستان کی طرف سے سفارت کی خدمت انجام دے کر اسی زمانہ میں واپس ہوا تھا، اس کے ایک سال بعد ۱۰۲۱ھ میں الٰہی کابل سے آگرہ آگیا، اسی سال اس کی ملاقات تقی اوحدی سے ہوئی، اس کے کچھ عرصہ بعد تقریباً ۱۰۲۳ھ سے ۱۰۳۴ھ تک الٰہی مہابت خاں کی ملازمت میں داخل ہوا، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی رسائی جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار تک میں ہوئی، ۱۰۴۱ھ میں ظفر خاں احسن کے ساتھ کشمیر گیا، اور آخری عمر تک یہیں مقیم رہا اور ۱۰۶۳ھ میں یہیں اس کی وفات ہوئی: "بود سخن آفریں" سے اس کا سال وفات نکلتا ہے، اور یہی مادۂ تاریخ اس کے لوح مزار پر کندہ ہے۔

الٰہی ایرانی مذاق سخن رکھتا تھا، اور شاعری میں اس کا مرتبہ بلند تھا۔ تقی اوحدی اسے "مجموعۂ کمال ہمہ دانی" اور صالح کنبوہی لاہوری "مظہر فیض نامتناہی" کے الفاظ سے اسے یاد کرتے ہیں۔ الٰہی جب ہندوستان آیا تو اس وقت اس کی جوانی کا زمانہ تھا، تقی اوحدی نے اس کے ایک سال بعد ۱۰۳۲ھ میں اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا، آگرہ میں الٰہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، اس کی ملاقات کا ذکر اور تاثر اوحدی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"الحق جوانیست در غایت دقت طبع و ادراک عالی، کمال شوخی فطرت و صفائی خاطر دارد و آب نطقش در نہایت عذوبت، ابر فکرتش در غایت رطوبت بر ہر گونہ سخن قدرتی تمامش ہست، اگر توفیق مشق یابد شاعری بغایت خوب خواہد شد،

تا غایت دو ہزار بیت گفتہ، ادراک درست رسائی دارد سخن نیز خوب میرسد۔"

محمد صالح کنبوہی لاہوری جس کو الٰہی کے آخری دور کا ہم عصر کہا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتا ہے :-

"۔۔۔۔ میر الٰہی کہ با فیضی رابطہ الٰہی دارد و با سخن استیناس طبیعی، طرز سخنش بسیار تازہ و اشعارش بلند آوازہ۔ لطف کلامش از قیاس افزوں و جزالت الفاظش از خیال بیروں است۔ در قصیدہ تصد ہائے نیکو می کند و در غزل معنی برجستہ می بندد استعارہ و تازہ گوئی را بمرتبۂ کمال رسانیدہ و در خانۂ بیت خصوصیات دیگر را طفیل دانستہ، بیشتر در تازگی ادا و نزاکت و استعارہ می گوید۔"[1]

الٰہی کی تصنیفات میں زیر نظر تذکرہ کے علاوہ اس کا دیوان ہے، جو برٹش میوزیم اور برلن کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے نامور شاعر اور اہل قلم کے حالات لکھتے وقت کسی تذکرہ نگار نے اس کے تذکرۂ شعراء کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۲) دفتر عصمت —— یہ خواتین شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کی اطلاع مولوی عبد الشکور المعروف بہ رحمان علی کے تذکرۂ علمائے ہند سے ملتی ہے۔ مولوی حافظ عبد اللہ بلگرامی کے سلسلہ میں انہوں نے اس تذکرہ کا ذکر کیا ہے اس کی عبارت یہ ہے :-

"وی (مولوی حافظ عبد اللہ بلگرامی) تصانیف زیادی بعربی و فارسی و اردو دارد آنچہ فارسیست عبارتست از مفیض فارسی در قواعد فارسی، دفتر عصمت تذکرۂ زنان سخنور، شاہد نظم شرح گلدستۂ دانش، مکاتیب و اشعار۔"[2]

دفتر عصمت کا اب وجود باقی نہیں بلکہ کسی دوسری جگہ اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ مولف تذکرہ

لے خوقات العاشقین ص ۔۔۔ ۲۲ ؛ ۲ے عمل صالح ۔۔۔ ص ۔۔۔ ؛ تے تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰۴، ۱۰۵ ؛

کا حال بھی صرف تذکرۂ علمائے ہند میں ہے۔ ان کا نام عبد اللہ تھا، اور مولوی حافظ عبد اللہ کے نام سے معروف تھے۔ والد کا نام سید آل احمد واسطی تھا، نسباً سادات واسطی حنفی المذہب اور قادری المشرب تھے، قصبۂ بلگرام میں ولادت ہوئی۔ اپنے عہد کے نامور علماء و فضلاء سے اکتساب علم کیا۔ حفظ قرآن کے ساتھ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، تفسیر و فقہ اور حدیث میں استاد اور بنارس کے مدرسہ عربیہ میں عہدۂ معلمی پر فائز تھے۔ ۱۲ رمضان ۱۳۰۵ھ کو ان کی وفات ہوئی۔ کسی نے سال وفات اس قطعہ سے ظاہر کیا۔ ؎

بگو ہیہات چو عبد اللہ حافظ سوی ملک بقا ناگاہ رفتہ
بسال رحلتش ہاتف ندا داد بجنت خاک پاک عبد اللہ رفتہ
۱۳۰۵ھ

(۱۳) سفینۃ الشوق —— اس تذکرہ کا مولف رائے منکھ رائے شاہ جہان آبادی تھا جس کا تخلص شوق تھا۔ اس تذکرہ کا کوئی وجود نہیں بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"رائے منکھ رائے شوق، خلف اصغر رائے مجلس رائے نائب دیوان خالصۂ شریفہ از عمدہ ہائے معروف شاہ جہان آباد است، طبع ارشاد و کمال ادراک داشت، ہنگام اختلال سلطنت ہندوستان بوقوع حادثۂ شورش افغان در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد۔۔۔ ترک وطن کردہ وارد اکبر آباد شد دران ایام تذکرۂ ای مسمی بہ سفینۃ الشوق تالیف مینمودہ، گاہی شعر ہم میگفت۔"[2]

(۱۴) سفینۂ عشرت :—— یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے، اس کا مولف درگا داس عشرت ہے۔ عشرت کے بارے میں تذکرے بالکل خاموش ہیں۔ سفینۂ عشرت کی

لے تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰۴، ۱۰۵ ؛ ۲ے سفینۂ ہندی ص ۱۱۴ ؛

پہلی جلد خدا بخش کتب خانہ بانکی پور پٹنہ میں موجود ہے۔ لیکن دوسری جلد اب نایاب ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ اس تذکرہ میں "ش" سے "ی" تک کے شعراء کا ذکر رہا ہوگا۔ کیونکہ پہلے حصہ میں "الف" سے "س" تک کے شاعروں کا ذکر ہے پہلے حصہ میں حروف تہجی کی ترتیب سے قدیم و جدید شعراء کا ذکر ہے، اس تذکرہ کی تالیف ۱۱۷۵ھ میں ہوئی، اس کا نام تاریخی ہے۔

(۱۵) عارف الآثار ——— اس کے مؤلف خواجہ محمد عارف بقائی بخاری ہیں جو دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی کے ابتدائی دور کے شاعر ہیں ان کے ہم عصر نامور مورخ ملا عبدالباقی نہاوندی نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خواجہ عارف نے ایک تذکرہ عارف الآثار کے نام سے آگرہ کے مقام پر تالیف کیا تھا، اسی تذکرہ کے حوالہ سے ملا عبدالباقی نہاوندی نے خواجہ عارف کا حال بھی قلم بند کیا ہے،

خواجہ عارف بقائی بخارا میں پیدا ہوئے ملا مشفق بخاری کے شاگرد تھے تحصیل علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد ایک عرصہ تک ماوراء النہر میں ازبک بادشاہوں کی ملازمت سے منسلک رہے، ۹۷۹ھ میں ہندوستان کا رخ کیا اور اڑیسہ و بنگال میں مقیم ہوئے۔ کچھ دن یہاں گذار کر دارالحکومت آگرہ گئے، ایک مدت یہاں بسر کرنے کے بعد دکن کا رخ کیا اور سپہ سالار اعظم خانخانان (عبدالرحیم) کی ملازمت اختیار کی، خان خاناں کی تعریف میں ایک مثنوی شاہنامۂ فردوسی کی بحر میں لکھی، اور اس کا نام "گلشن اشعار" رکھا مثنوی کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:۔

در آن خانۂ صورت بی روان چراغی برافروخت از نور جان

مولف ماثر رحیمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ عارف کی ایک دوسری تالیف مجمع الفضلا بھی

خانخانان کی مدح میں ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

"خواجہ عارف بقائی در عارف الآثار کہ از مصنفات اوست گوید تولد من در بخارا واقع شدہ...... مدتہا در ماوراء النہر...... بودم و بتاریخ تسع و تسعین و سبعین و تسعمایہ...... در ولایت اڑیسہ و بنگالہ بودہ و از انجا بدارالخلافہ آگرہ و تذکرہ خود را کہ عارف الآثار نام نہادہ در دارالخلافہ آگرہ نوشتہ و بعد از مدتی کہ در ہندوستان بودہ بصوبہ دکن آمدہ، در بندگی این سپہ سالار (خانخانان) بنظم اوردہ ...... و تصنیف دیگر کردہ کہ مجمع الفضلا نام کردہ و آن نیز مبنی بر مدح این نامدار است و خود از جملۂ مداحان اوست"[1]

اس عبارت کا آخری حصہ جو مجمع الفضلاء سے متعلق ہے، عبدالباقی نہاوندی کی غلط فہمی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ مجمع الفضلاء کو انھوں نے خانخاناں کی مدح میں لکھی گئی کتاب بتایا ہے، حالانکہ وہ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لاہور یونیورسٹی پنجاب (پاکستان) میں ناقص الآخر موجود ہے۔ اسی مخطوطہ کی بنیاد پر ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اپنی کتاب "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" میں اس کا ذکر فارسی شعراء کے تذکرہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ مولف ماثر رحیمی کی اس غلط فہمی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ عارف الآثار ہی مجمع الفضلاء ہے اور غلط فہمی میں انھوں نے عارف الآثار کو تذکرہ اور مجمع الفضلاء کو خانخانان کی مدح سمجھ لیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے سامنے دونوں مخطوطے ایک وقت میں موجود نہیں رہے ہوں گے لیکن یہ باتیں صرف قیاس ہیں قطعی طور پر ماثر رحیمی کی بات کی تردید مشکل ہے، ڈاکٹر علی رضا نقوی نے بھی اپنی کتاب میں مجمع الفضلاء کے ذکر میں اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا کہ عارف الآثار اور مجمع الفضلاء دونوں ایک ہیں یا دونوں الگ الگ کتابیں ہیں،

[1] ماثر رحیمی ج ۳ ص ۱۱۔ ۱۲۶۵

بہر حال، جب تک یہ اس کی تحقیق نہیں ہو جاتی کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں، اس وقت تک ہم عارف الآثار اور مجمع الفضلاء کو خواجہ عارف کے دو تذکروں کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، چونکہ عارف الآثار کا اب کوئی وجود نہیں ہے، اس لئے یہ تذکرہ نایاب کہا جائے گا۔

(۱۶) **قند پارسی اور سخن الشعراء** ـــــ یہ بھی نایاب تذکرہ ہے، کسی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ یہ تذکرہ تیرہویں صدی ہجری میں لکھے گئے کئی فارسی تذکروں کا ماخذ رہا ہے۔ ابوالقاسم محتشم[1] اور سید نورالحسن بھوپالی نے اپنے تذکروں میں اس کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس تذکرہ کے نسخے تیرہویں صدی ہجری کے آخری زمانے تک موجود تھے لیکن اب یہ نایاب ہے۔

قند پارسی کے مولف مولوی عبدالغفور خاں بہادر المتخلص بہ نساخ ہیں[2]، نساخ مولف شمع انجمن کے معاصر تھے، مولف شمع انجمن نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے نساخ کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے باپ کا نام قاضی فقیر محمد تھا جو وکیل عدالت تھے اور ان کے بھائی مولوی عبداللطیف خان بہادر انگریزوں کے یہاں بلند عہدہ پر فائز تھے، نساخ کی ولادت کلکتہ کے مقام پر ۱۲۴۹ھ میں عیدالفطر کے دن ہوئی اور یہیں اپنی تحصیلات مکمل کیں اور فارسی زبان وخط نسخ میں مہارت نامہ حاصل کی۔ تادم تحریر (۱۲۹۴ھ) وہ انگریزی سرکار کی طرف سے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کی مجسٹریٹی اور کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔

مولف شمع انجمن نے نساخ کے نام سے ایک دوسرا تذکرہ منسوب کیا ہے۔ جس کا نام

---

[1] دختر نایاب ص ۴ ؛ [2] نگارستان سخن ص ۱۲۱ ؛

"سخن الشعراء" ہے[1]۔ اتفاق سے یہ تذکرہ بھی اب نایاب ہے۔

(۱۷) **مجمع البلغاء** ـــــ اس تذکرہ کا مولف مشہور شاعر اور ادیب میر علی شیر قانع تتوی (متوفی ۱۲۰۳ھ) کا لڑکا میر سید غلام علی ہے جو خود بھی اچھا شاعر تھا اور مائل تخلص کرتا تھا، قانع نے ۱۱۷۵ھ میں سندھ کے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ مقالات الشعراء کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مائل نے والد کی وفات کے بعد مجمع البلغاء کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جو مقالات الشعراء کے سلسلہ کی آخری کڑی یا اس کا تکملہ تھا۔ مائل نے اس میں مقالات الشعراء کے درج شدہ شعراء کے بعد سے اپنے عہد تک کے ان فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے جو سندھ میں رہتے تھے، اس تذکرہ کی تالیف ۱۲۱۹ھ میں ہوئی مگر اب اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں اور وہ اب نایاب ہے۔

تذکرۂ مجمع البلغاء کے متعلق جو اطلاعات موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۹ھ میں مرتب ہوا، اس میں تقریباً ۹۳۹ اوراق تھے اور ۲۵۰۰ منتخب اشعار مختلف شعراء کے نقل کئے گئے تھے[2]۔

مولف تذکرہ مائل مسمی بہ میر غلام علی ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوا، شعر گوئی کا ذوق باپ سے ورثہ میں ملا تھا، تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ ۱۲۵۱ھ میں مائل کی وفات ہوئی۔ اس کی تالیفات یہ ہیں:۔

(۱) دیوان فارسی (غزلیات) (۲) دیوان اردو (۳) دیوان فارسی (قصائد، منقبت، ساقی نامہ و رباعیات وغیرہ) (۴) مجمع البلغاء۔

(۱۸) **مخزن اخبار** ـــــ اس تذکرہ کا ذکر ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی کے مشہور

---

[1] شمع انجمن ص ۴۸۹ - ۴۸۰ ؛ [2] تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ۲ ص ۱۲۹-۱۳۲ ؛

تذکرہ میخانہ میں ہے۔ ملا قزوینی نے اس تذکرہ میں "مخزن اخبار" کے حوالہ سے چھ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ساقی نامہ کہا تھا۔ ان شعراء کے نام ہیں نظامی گنجوی، (ص ۱۲) شیخ فخر الدین عراقی (ص ۲۸) امیر خسرو دہلوی (ص ۵۹، ۶۲، ۶۴) خواجو کرمانی (ص ۸۰) عبد اللہ ہاتفی جامی (ص ۱۲) حکیم پرتوی لاہیجانی شیرازی (ص ۱۲۶)؛

ملا قزوینی نے تذکرہ کے مولف کا نام امیر مختار لکھا ہے۔ مولف کے بارے میں اس سے زیادہ کہیں سے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ خیال ہے کہ ۹۴۱ھ اور ۱۰۲۸ھ کے درمیانی زمانے میں یہ تذکرہ ہندوستان میں لکھا گیا۔[1]

(۱۹) معاصر الشعراء ــــــ یہ ایک مختصر تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویس نے اپنے معاصر شعراء کا ذکر کیا تھا۔ اس تذکرہ کا کہیں وجود نہیں۔ مولف گلزار اعظم نے غلام دستگیر نایطی المتخلص بہ لائق کے ذکر میں اس تذکرہ کو لائق کی تالیف قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"تذکرہ ای بکمال اختصار بطور بیاض ترتیب دادہ و نامش معاصر الشعراء نہادہ"

حکیم غلام دستگیر خان بن غلام احمد نایطی کا لقب غیاث اور تخلص لائق تھا۔ حکیم باقر حسین خان راقق کے بھانجے تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مولوی واقف اور حاجی زین العابدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی میں بھی اس دور کے مشہور علماء سے استفادہ کیا۔ طب میں خاص مہارت پیدا کی۔ شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا اور اساتذۂ فن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔[2]

(۲۰) معدن الجواہر ــــــ اس تذکرہ کا ذکر بھی گلزار اعظم کے مولف نواب غوث خان بہادر ہی نے کیا ہے۔ اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ معدن الجواہر میں

لہ تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ۲ ص ۱۴۳ ؛ [2] گلزار اعظم ص ۴، ۳۰ ؛ [3] ایضاً

چند نامور اساتذہ پر بے جا اور غلط اعتراض کئے گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا دوسرا تذکرہ بنام گلزار اعظم اس کے جواب میں لکھا۔

معدن الجواہر کا مولف ۔۔۔۔ مولوی محمد مہدی بن محمد عارف الدین خان رونق واصف تخلص کرتا تھا۔ اس کی ولادت ۱۲۱۷ھ میں مدراس میں ہوئی۔ فارسی کی تعلیم اور شاعری کی مشق والد کی صحبت میں اور عربی اور علوم معقول و منقول کی تحصیل اس خطہ کے نامور علماء سے کی۔ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک درسگاہ میں نوجوان انگریزوں کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر سترہ سال تک قائم رہے۔ بعد میں اس سے علٰحدہ ہو گئے اور نواب اعظم (مولف گلزار اعظم) کے مجلس مشاعرہ میں شریک ہو کر نواب کی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔[1]

واصف اپنے عہد کے نامور اہل قلم ہیں ان کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں،

(۱) دلیل ساطع، (۲) حکایات دلپسند؛ (۳) گلزار عجم مختصر برہان قاطع؛ (۴) تذکرۂ معدن الجواہر؛ (۵) مطلوب الاطباء ترجمہ موجز (اردو) (۶) ترجمہ آداب الصالحین (۷) دلیل الشعراء؛ (۸) رقعات واصفی؛ (۹) املانامۂ واصفی؛ (۱۰) خلاصۃ التکمیل (۱۱) روضۃ العابدین ترجمہ در مختار؛ (۱۲) حدیقۃ المرام (عربی)

تذکرہ معدن الجواہر کا کوئی نسخہ آج دستیاب نہیں، اور اب یہ نایاب ہے۔

(۲۱) مرقع ظفر خان احسن ــــــ ظفر خان احسن شاہجہان اور جہانگیر کے عہد میں نامور سیاست دان اور انتظامی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے باپ خواجہ ابو الحسن تربتی کی جگہ کشمیر کی صوبہ داری کی نیابت کی۔ بعد میں کشمیر اور کابل کے

[1] گلزار اعظم ص ۳۹۷ تا ۳۹۹ ؛ [2] ایضاً ص ۳۹۰ تا ۳۹۹ ؛

صوبہ دار بنائے گئے، سیاست میں نام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی پرورش میں نمایاں حصہ لیا، شعراء، ادبا، اور علماء کی کثیر تعداد ان کی ذات سے وابستہ تھی، انھوں نے خود بھی کئی شعری اور نثری کارنامے یادگار چھوڑے۔ شاعری سے فطری ذوق کی بنا پر ان کو معاصر شعراء کی صحبت بڑی عزیز تھی۔ چنانچہ احسن نے اپنے ہم عصر شعراء کا کلام خود ان ہی کے ہاتھوں سے لکھوا کر ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا، جس میں ان شعراء کی تصویریں بھی تھیں۔ سرخوش نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"تذکرۂ اشعار شعرائے کابل کہ باری ربط و آشنائی داشتند . . . . انتخاب ہر کدام بخط او نویسانیدہ برپشت ہر ورق صورت آن معنی سنج نیز ثبت کردہ بود، یک ورق کہ بر و شبیہہ کلیم بودہ، فقیر دیدہ و صورتش را زیارت کردہ ام"[1]

سرخوش کے علاوہ خوشگو[2] اور آزاد[3] نے بھی اسے "مجموعہ" ہی کہا ہے، لیکن مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن[4] اور نواب علی بن ابراہیم خلیل اسے مجموعہ کے بجائے "بیاض" کہتے ہیں، ڈاکٹر علی رضا نقوی[5] نے سرخوش اور خوشگو کے قول کو رد کرتے ہوئے اس انتخاب کا نام مرقع رکھا ہے،

افسوس کہ اب اس مرقع کا کوئی وجود نہیں، بقول مولانا شبلی نعمانی[6] اگر یہ مرقع آج ہاتھ لگ جائے تو اس کی قیمت لاکھ روپیے سے بھی زیادہ ہوگی۔

---

[1] کلمات الشعراء ص ۴؛ [2] سفینۂ خوشگو؛ [3] نمرد آزاد؛ [4] بزم تیموریہ صباح الدین عبدالرحمٰن جلد اول؛ [5] صحف ابراہیم ص ۷۶؛ [5] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ورق ۱۳؛ [6] فہرست مخطوطات بانکی پور نمبر ۱۸۱؛

ڈاکٹر تاراچند کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

از جناب الطاف حسین خان صاحب شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

افسوس ہے ابھی ہمارے آنسو پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے انتقال پر خشک نہیں ہوئے تھے کہ ہمکو اپنے ایک دوسرے عظیم مورخ ڈاکٹر تاراچند کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مجھے دو مرتبہ حاضر ہونے کا شرف نصیب ہوا ہے ایک مرتبہ اپنے ایک تاریخی مقالہ کے سلسلہ میں جو معارف میں نامکمل صورت میں شائع ہوا، اور دوسری مرتبہ اپنی کچھ تاریخی گتھیوں کے سلجھانے کے سلسلہ میں،[1] مرحوم کا اخلاق، ان کی محبت، ان کا علم کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے ہماری علمی مجلس میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جو کبھی پر نہیں ہوسکتا ہے

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

میرے مقالہ "ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ اور مورخین پر ایک تنقیدی جائزہ و[2] پروفیسر حبیب

---

[1] دوران ملاقات ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "مشرق میں ڈاکٹر عسکری صاحب پٹنہ یونیورسٹی اور مغرب میں ڈاکٹر عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی فارسی کے ان شعراء کے سلسلہ میں اچھا کام کر رہے ہیں، جنھوں نے ہندوں اور ہندوستان سے محبت کا تذکرہ اپنے کلام میں کیا ہے، خدا کا شکر ہے ہمارے دوآبہ (میرا وطن فتحپور گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں واقع ہے) میں آپ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے، اس وقت ہم سب کو ہندوں اور مسلمانوں کی محبت کی بھولی بسری داستانیں سنانا ہے تاکہ سینوں میں نرم گوشے پیدا ہوں اور شک و شبہ کا ماحول چھٹے۔"

[2] دیکھئے:۔ معارف، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء

ایک تعارف سپرد قلم فرمایا تھا، جو اتفاق سے ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس موقع پر یہ میرا علمی فرض تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس تحریر کو معارف پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس تحریر کو ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

تعارف: قرون وسطیٰ کی تاریخ کے متعلق مورخوں کی رایوں میں جس قدر اختلاف پایا جاتا ہے اتنا فرق ہندوستان کی تاریخ کے اور کسی دور کے بارے میں نہیں، انگریز مورخوں نے کچھ تو اپنی سیاسی ضروریات کے تحت اور کچھ ایشیائی راج اور سماج کے بنیادی اصولوں اور ہندوستانی ذہنوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اس زمانے کی تاریخ کو مسخ کر دیا ہے، یورپ کا موجودہ زمانے کا ذہن اور اس ذہن پر قائم موجودہ معاشرہ مشرق کے نظام سے اس قدر دور ہیں کہ یورپ کے فلسفی اور تاریخ دان اس کے سمجھنے میں زیادہ تر ناکام رہے ہیں، مغربی تعلیم کے اثر اور یورپ کے علمی ارتقا نے ہندوستانی ذہنوں کو اس قدر مرعوب کر دیا ہے کہ ہمارے مورخ مغربی تاریخی اصولوں اور طریقوں کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں، پھر بھی انسان کے ذہن میں فطرتی آزادی کار فرما ہے، اس لیے کچھ لوگ ضرور کوشش کرتے ہیں کہ ذہنی غلامی کی زنجیروں کو توڑیں اور آزاد ہندوستان میں بے لاگ طریق خیال کو اپنائیں۔

اس آزاد خیالی کی جس قدر گذشتہ زمانہ کے سمجھنے میں ضرورت ہے اتنی شاید کسی اور شعبہ علم میں نہیں ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ علم کی بنیاد سچائی پر ہے اور سچائی ہر طرح کے تعصب سے پرہیز کرتی ہے، حق کی تلاش اور حق کی دریافت فرد اور سماج دونوں کے لیے لازم بھی ہے اور مفید بھی۔ حق پرست انسان اخلاقی عظمت کی اہلیت حاصل کرتا ہے اور حق پرستی ملت کی یک جہتی اور محبت کی کڑیوں کو مضبوط بناتی ہے، تاریخ ملت کے ماضی کی یاد ہے، جو ملت کے حال اور مستقبل کی کڑیوں کو جوڑتی ہے، تاریخ اسکی انفرادیت

اور خصوصی کردار کی آئینہ دار ہے، تاریخ داں کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ ہے، کیونکہ اس کی تالیف اور تصنیف کا قوم کے افراد پر اور کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے، گمراہ کن تاریخ ناقابل معافی جرم ہے، چونکہ اس سے قوم کا ذہن بگڑتا ہے، اور ذہن کی خرابی قوم کے قوام کو کمزور کرتی ہے۔

افسوس کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر پرایوں ہی نے نہیں اپنوں نے بھی اس کی نقل میں سخت ظلم کیا ہے، جس کی وجہ سے ملک میں وہ تاریک فضا پھیلی جس نے ہندوستان کو شک وشبہہ خوف اور حرص کی گھٹاؤں سے ڈھانپ رکھا ہے، اگر امید، امن، مسرت اور ترقی کے اجالے سے دلوں کو بھرنا ہے تو صحیح تاریخ کا سہارا ضروری ہے، شری الطاف حسین خاں شروانی نے کچھ ایسے ہی جذبوں کے تحت قرون وسطیٰ کی تاریخ اور مورخین پر تنقیدی تبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان کی کوشش اور انکا مقصد قابل تحسین ہے، اس لیے بھی کہ فارسی تاریخ نویسوں نے اپنے زمانہ کے ماحول کے مطابق کتابیں تصنیف کیں، یہ مورخ زیادہ تر ایسے علماء تھے جن کا ذہن کتابی دائروں اور فقہی بحثوں سے آگے نہیں جاتا تھا، ان کی دنیا عمل کی دنیا نہیں تھی، انھیں سیاسی اور معاشی حقیقتوں سے کوئی واسطہ نہ تھا، لکیروں کے فقیر تھے، اور جدت سے متنفر، چھ سو سال کے طویل زمانہ کا جائزہ لیں تو علماء کی تحریروں میں بادشاہوں کے طرز عمل کی تنقید زیادہ ملے گی، شریعت سے انحراف کے تذکرے، اسلامی شعائر سے تغافل کی شکایتوں سے تاریخ بھری ہوگی، یہی کتابیں زمانہ حال کے ہندی اور غیر ہندی مورخوں کا سرمایہ ہیں۔ کم لوگوں نے کوشش کی ہے کہ فارسی ماخذوں کا تجزیہ کرنے کے بعد سچ اور جھوٹ، افراط اور تفریط، تخیل کی پرداز اور ذہنوں کے میلان کا اندازہ لگائیں۔ میں

اس مختصر رسالہ کے نوجوان مولف کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس کی طرف توجہ کی، اور کچھ حقیقتوں کے واضح کرنے کی زحمت برداشت کی۔ ظاہر ہے اس پہلی تصنیف میں اس وسیع موضوع کا احاطہ ممکن نہ تھا، لیکن یہ حرفِ اول ہے۔ امید ہے ان کی سعی جاری رہے گی اور ان کے قلم سے ایسی مبسوط کتاب معرض تحریر میں آئے گی، جو تاریخ کے اس اہم پہلو پر روشنی ڈالے گی، اور جس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔"

(ڈاکٹر) تاراچند

(۱۶۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد)

مطبوعات جدیدہ

خلافت راشدہ اور ہندوستان، مرتبہ۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت لعہ قیمت غیر مجلد شے، پتہ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

عرب و ہند کے تعلقات، اور ان سے متعلق مباحث فاضل مصنف کا خاص موضوع ہے، اور اس پر وہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں زیر نظر کتاب میں خلافت راشدہ کے زمانہ میں عرب و ہند تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے، پہلے مختصراً عہد رسالت میں پھر خلافتِ راشدہ میں دونوں ملکوں کے جو تعلقات رہے، ان کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اس سلسلہ میں اس دور میں ہندوستان میں غزوات، فتوحات اور یہاں کے سیاسی و انتظامی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور آخری ابواب میں اس عہد میں ہندوستان میں عربوں کی آمد اور عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی اور ہندوستان میں آنے والے صحابہ و تابعین کے مختصر تراجم سے متعلق بھی معلومات فراہم کیے گئے ہیں، یہ کتاب محنت و تحقیق اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے، لیکن حشو و زوائد سے خالی نہیں، مصنف کی کئی کتابوں کا مرکزی موضوع یہی رہا ہے، اس لئے ان میں یکسانیت کے علاوہ بعض مباحث کا تکرار بھی ہے، شروع میں مراجع و مصادر کی مفصل فہرست دی گئی ہے، اس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی اس موضوع کی عظیم الشان کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کا ذکر پتہ نہیں کیوں رہ گیا ہے،

قرآن مجید کا چیلنج - مرتبہ۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر صفحات ۱۲۸ مجلد مع گردپوش، قیمت ۶ روپے ناشر دائرۃ المصنفین مبارکپور اعظم گڈھ، یو۔پی

اس میں قرآن مجید کی ان آیتوں پر بحث کی گئی ہے، جن میں منکرین و مخالفین سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس کے مانند کوئی اور سورہ یا آیت پیش کریں، لائق مصنف نے پہلے ان آیات کے متعلق قدیم و جدید اہم مفسرین کے خیالات نقل کر کے یہ دکھایا ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک تحدی کی نوعیت لفظی ہے یعنی قرآن فصاحت و بلاغت اور طرز ادا کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن بعض کے خیال میں اس کی نوعیت معنوی ہے یعنی قرآن کی دعوت و تعلیم اس کے نظریہ توحید و آخرت اور اس کے دلائل و شواہد کا کوئی جواب ممکن نہیں، مصنف کے نزدیک قرآن کی فصاحت و بلاغت مسلم ہونے کے باوجود دوسرا نقطۂ نظر مرجح ہے، اور اس کو انھوں نے مدلل طور پر واضح کیا ہے، اور پہلے نقطۂ نظر پر مختلف اشکالات اور شبہات وارد کئے ہیں، ممکن ہے ان کی بعض توجیہات سے کسی کو مکمل اتفاق نہ ہو تاہم مجموعی حیثیت سے ان کی رائے میں وزن ہے اور یہ کتاب وسیع مطالعۂ قرآن کا نتیجہ ہے لیکن کہیں کہیں ٹھیٹ ہندی الفاظ جیسے سگھن، باشی (بجائے باسی) چالو اور ہڑبونگ وغیرہ کا استعمال ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

تذکرۂ سعید۔ مرتبہ۔ جناب افضل اقبال صاحب ایم اے تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۳۶، قیمت تحریر نہیں، پتے (۱) سعیدیہ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد (۲) مکتبۂ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد وغیرہ،

حیدرآباد دکن کا کتب خانہ سعیدیہ لائبریری وہاں کے مشہور اہل علم بزرگ اور عدالت العالیہ کے چیف جسٹس مفتی محمد سعید خاں (م ۱۸۹۵ء) کی یادگار ہے، جہاں عربی و فارسی کی قدیم اور اہم قلمی کتابوں کا عمدہ ذخیرہ ہے، اب اس کے ماتحت ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بھی قائم کیا گیا ہے اور اسی کی طرف سے سوونیر شائع کیا گیا ہے، جو مختلف اصحاب قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں مفتی صاحب مرحوم کے حالات و کمالات، ان کے خاندان کے کارنامے، کتبخانہ کی سرگذشت، اس کے متعلق ضروری معلومات و کوائف اور بعض اہم نوادر کے خصوصیات تحریر کئے گئے ہیں، ایک مضمون میں مفتی صاحب کے خانوادہ کی خواتین کی ادبی و تصنیفی خدمات اور ملی، سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا ذکر ہے، ڈاکٹر محمد یوسف الدین استاذ عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک ریڈیائی تقریر بھی شامل ہے جس میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و تمدن، اور بعض دوسرے شعبوں میں تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے، شروع میں مشاہیر علم و قوم کے وہ تاثرات نقل کئے گئے ہیں جو انھوں نے لائبریری کے معائنہ کے وقت قلمبند کئے تھے، آخر کے انگریزی حصہ میں وزراء و اعیان حکومت کے پیغامات اور لائبریری اور انسٹی ٹیوٹ کے متعلق مفید معلومات دئے گئے ہیں۔ اگر لائبریری کے مخطوطات کی فہرست شائع کردی جاتی تو علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملتی۔

صحیفۂ بشارت۔ مرتبہ۔ جناب مبشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت غنیمت صفحات ۴۰، قیمت للعہ، پتہ مصنف سے گلی وحید بخش، محلہ سوتھ۔ بدایوں۔

یہ لائق مصنف کے چند ادبی و تنقیدی اور دو ایک تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں سودا و حالی کی شاعرانہ خصوصیات، اکبر کی ظرافت، جگر مرادآبادی کے تغزل اور مجاز و نریش کمار شاد کی ترقی پسندانہ شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، دو مضامین نذیر احمد کی ناول نگاری اور عبدالحلیم شرر کی مقالہ نگاری پر ہیں، ایک مضمون میں اردو میں مزاح نگاری کا اور ایک دوسرے میں اردو کے تین اہم تذکروں نکات الشعراء (میر)، آب حیات (آزاد) اور گل رعنا (حکیم عبدالحی) کا تقابلی مطالعہ ہے، آخر میں چند کتابوں پر تبصرے بھی ہیں، گو تمام مضامین مختصر اور بعض تشنہ بھی ہیں، تاہم مصنف کی رایوں میں اعتدال اور تحریر میں سلاست ہے، اختصار کی بنا پر یہ مجموعہ طلبہ کیلئے خصوصیت سے مفید ہوگا،

انسانی فریضہ ۔ مرتبہ ۔ جناب افتخار فریدی صاحب چھوٹی تقطیع کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۔ تحریر نہیں صفحات ۶۴ ، پتہ مصنف سے فریدی بلڈنگ ، سنبھلی گیٹ مراد آباد ،

مصنف تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز اور سرگرم کارکن ہیں ، اس رسالہ میں انھوں نے تبلیغ و دعوت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور اس کو مسلمانوں کا اصلی فریضہ قرار دیا ہے ۔ اور موجودہ دور کے ابتر حالات ، انسانیت کی تباہی ، اخلاقی و ذہنی پستی ، مادیت و خدا فراموشی وغیرہ کا ذکر کر کے انسانوں کی صحیح رہنمائی اور دعوت و شہادت علی الناس کے فریضہ کی جانب امت کو توجہ دلائی ہے ۔ اور ضمناً تبلیغ و دعوت کے ضروری اصول و آداب اور اتمام حجت کی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے ۔ اس سلسلہ میں مولانا تھانوی ، مولانا آزاد ، مولانا احتشام الحسن ، مولانا علی میاں اور مولانا امین احسن اصلاحی کی دعوتی و تبلیغی تحریروں کے اقتباسات بھی درج کر دیے ہیں ، اس حیثیت سے یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے سبق آموز اور بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے ۔

پیغام حیات ۔ مرتبہ جناب ہنس ریحانی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر ، صفحات ۱۶۲ قیمت ۔ ۳ روپیہ پتہ : ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ باکس ۱۵۳ حیدرآباد ، آندھرا پردیش ،

پیغام حیات ہندوستان کے چونتیس مسیحی شعراء کے اردو کلام کا مجموعہ ہے ، ہر شاعر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں عیسوی مذہب کے عقائد و افکار کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ اسی لئے اس کا نام پیغام حیات رکھا گیا ہے مرتب نے حاشیے میں مذہبی اصطلاحی الفاظ کی تشریح و وضاحت کر دی ہے مذہبی حیثیت سے قطع نظر یہ مجموعہ شاعرانہ لطف سے خالی نہیں ، اس سے اردو کی غیر فرقہ واریت اس کی ہمہ گیری اور ہر مذہب و ملت میں یکساں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ (ض)

جلد ۱۱۴ ماہ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۴ء عدد ۲

مضامین